دو مسافر دو ملک

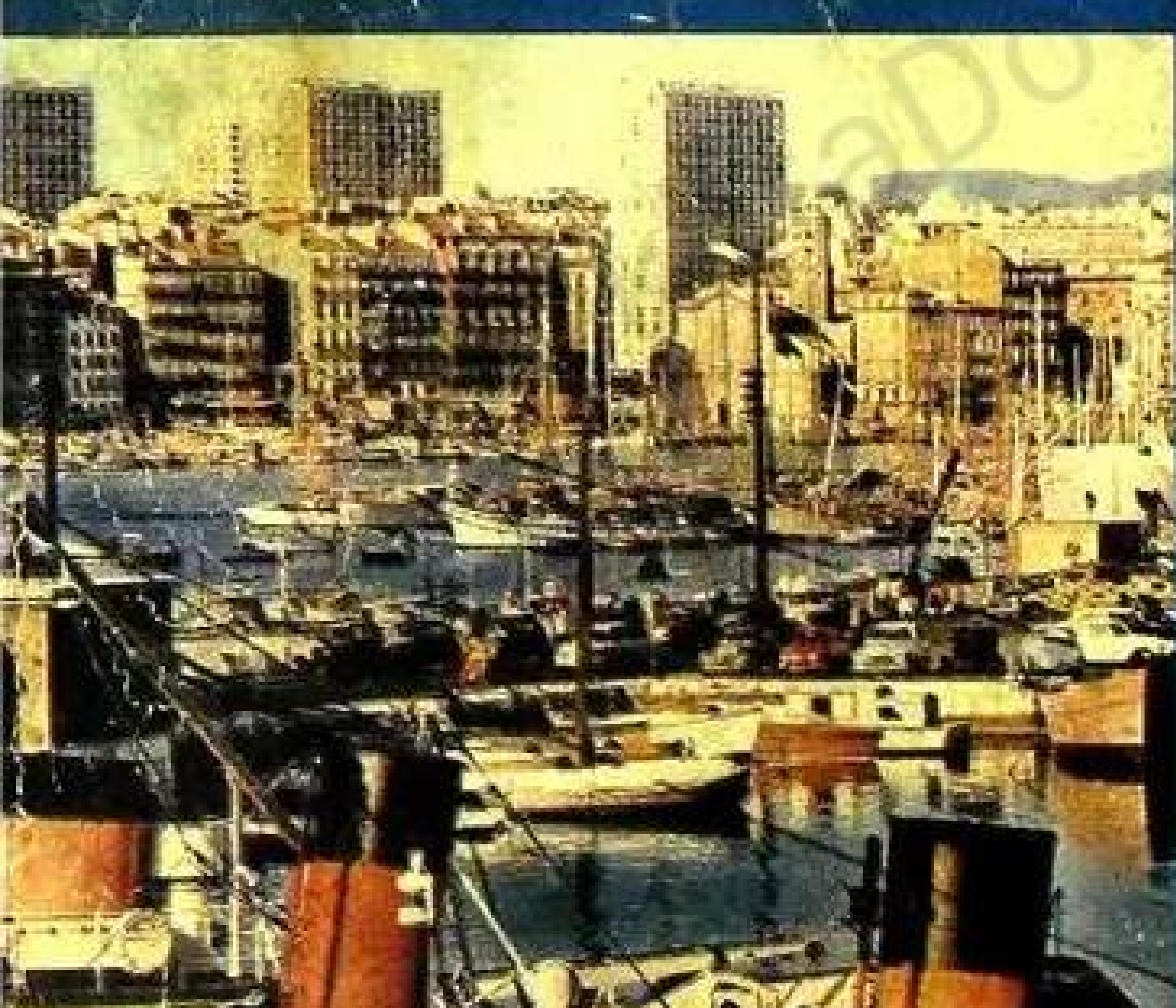

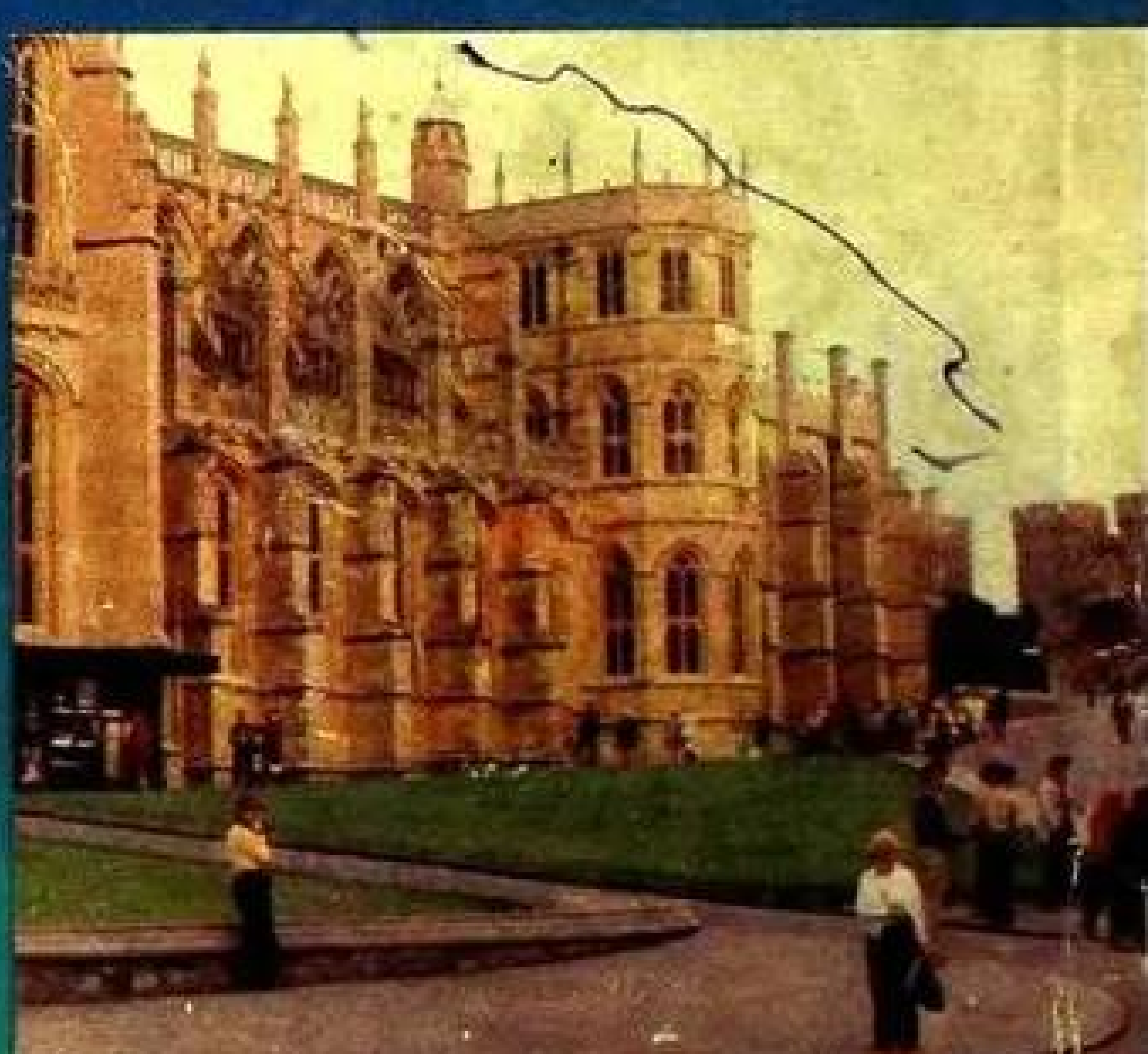

حکیم محمد سعید اور مسعود احمد برکاتی کے سفر
انگلستان و فرانس کے دل چسپ حالات

دو مسافر دو ملک

حکیم محمد سعید اور مسعود احمد برکاتی
کے سفر انگلستان اور فرانس کے تاثّرات

RekhtaDownload.com

مسعُود احمد برکاتی

ہمدرد فاؤنڈیشن پریس، کراچی

مجلسِ ادارت

حکیم محمد سعید

مسعود احمد برکاتی ------- رفیع الزماں زبیری

مصنف : مسعود احمد برکاتی

ناشر : ہمدرد فاؤنڈیشن پریس،
ناظم آباد، کراچی۔ ۷۴۶۰۰

طابع : ماس پرنٹرز
ناظم آباد، کراچی

اشاعت اول : ۱۹۸۹ء دو ہزار
قیمت : ۱۲ر رُپے

جملہ حقوق محفوظ

RekhtaDownload.com

پیش لفظ

جس طرح ساری دُنیا کا اندھیرا بھی ایک چھوٹے سے چراغ کی روشنی کو مٹا نہیں سکتا اِسی طرح ایک اچھی کتاب کے سامنے جہالت کے اندھیرے نہیں ٹھیر سکتے۔ تم اچھی طرح جانتے ہو کتاب اور عِلم کا ایک دوسرے سے گہرا تعلق ہے۔ عِلم آدمی کو انسان بناتا ہے، اشرف بناتا ہے، بُرے اور بھلے کی تمیز سکھاتا ہے اور کتاب ذہن کو جِلا بخشتی ہے، کتاب ذہن کو روشن کرتی ہے!

کتاب ایک اچھی ساتھی ہے، کتاب ایک سچّا دوست ہے۔ اچھا دوست وہی ہوتا ہے جو دوست کا بھلا چاہتا ہے۔ دوست یہ چاہتا ہے کہ ہم صاحبِ کردار ہوں، ہم میں امانت ہو، دیانت ہو، صداقت ہو۔ ہمارے اخلاق ایسے اچھے ہوں کہ سب ہمیں پسند کریں۔ ہماری ذات سے کسی کو دُکھ نہ پہنچے۔ اچھی کتاب ہمیں ایسا ہی اچھا انسان بنا سکھاتی ہے۔

جس طرح دُنیا میں اچھے اور بُرے لوگ ہیں، اسی طرح کتابیں بھی اچھی اور بُری ہوتی ہیں۔ اچھوں کی صحبت اچھا بناتی ہے اور بُروں کے پاس بیٹھ کر تو آدمی بُری باتیں ہی سیکھتا ہے۔ تمھیں ہمیشہ اچھی کتابیں تلاش کر کے پڑھنی چاہییں تاکہ تم اچھے بنو۔

بچّے مجھے عزیز ہیں۔ وہ سب میرے ہیں۔ میری خواہش ہے، اور میں چاہتا ہوں کہ میرے کِشورِ حسین کے نونہال نیک ہوں، اچھے ہوں، سچّے ہوں، بہادر ہوں اور ہمیشہ عِلم کی جستجو میں رہیں۔ اسی لیے ہمدرد نے "نونہال ادب" کا یہ سلسلہ شروع کیا ہے۔ اس منصوبے کے تحت تفریحی، معلوماتی سائنسی، دینی، اخلاقی، تاریخی اور ہر قسم کی مفید، معیاری اور خوش نما کتابیں آسان زبان میں شائع کی جارہی ہیں کہ جن کے مطالعے سے ہمارے نونہال تفریح کے ساتھ ساتھ اپنے ذہن کو روشن اور اپنے اخلاق کو سنوار سکیں۔

یہ کتاب نونہال ادب کے سلسلے کی ایک کڑی ہے۔

محمد سعید

(حکیم محمد سعید)

پہلی بات

۱۹۸۲ء میں یورپ کے سفر پر جانا ہوا۔ واپسی پر ہمدرد نونہال کا نومبر کا شمارہ ترتیب دیتے وقت ساتھیوں نے کہا کہ اپنے سفر کے بارے میں کچھ لکھ دیجیے۔ میں نے کہا کہ اس میں وقت لگے گا۔ اچھا تین صفحے خالی چھوڑ کر رسالہ پریس بھیج دیجیے۔ جب لکھنے بیٹھا تو اندازہ ہوا کہ

کچھ اور چاہیے وسعت میرے بیاں کے لیے

دوسری قسط اگلے شمارے میں لکھی اور اب پڑھنے والوں خصوصاً نونہالوں کے خطوط کا جو سلسلہ شروع ہوا اور داد ملنے لگی تو قلم رواں ہو گیا اور بیس قسطوں میں جا کر یہ سفرنامہ مکمل ہوا۔ ذہن پہ زور دیتا رہا اور جو باتیں یاد آتی رہیں لکھتا رہا۔ سفر کے دوران تو تاثرات لکھ نہیں سکا تھا، کبھی کبھی کچھ اشارے لکھے تھے۔ ان سے بھی کچھ مدد ملی، لیکن زیادہ تر انحصار ذہن پر تھا۔ اس لیے واقعات میں کوئی ترتیب بھی نہیں ہے۔ بعض باتیں کسی انداز سے دوسری بار بھی لکھی گئی ہیں۔

سفر میں اپنا وطن بہت یاد آتا ہے۔ جب دوسرے ملکوں کی کوئی اچھی بات دیکھتا تو دل چاہتا کہ اپنا پاکستان بھی ایسا ہی ہو۔ سفر سے آدمی بہت کچھ سیکھتا ہے۔ میں نے بھی سیکھا اور کوشش کی ہے کہ اسے اپنے پڑھنے والوں تک بھی پہنچاؤں۔

نونہالوں نے تو اسے پڑھا ہی، بزرگوں نے بھی اسے بڑے شوق سے پڑھا۔ ایک بچّی نے تو لکھا کہ جب سے رسالے میں یہ سفرنامہ شائع ہونا شروع ہوا ہے ہمارے ۸۲ سالہ دادا رسالہ آتے ہی لے لیتے ہیں اور "دو مسافر دو ملک" کے صفحات پڑھنے کے بعد رسالہ ہمیں دیتے ہیں، اس لیے بڑی بڑی قسطیں چھاپ کر جلدی سے سفرنامہ پورا کر دیجیے۔

بہرحال مجھے خوشی ہے کہ اردو زبان میں بچّوں کا یہ پہلا سفرنامہ لکھنے کا فخر مجھے حاصل ہوا اور یہ خود بچّوں ہی نے لکھوایا بھی، ورنہ میں شاید دو تین قسطیں لکھ کر ختم کر دیتا۔ بچّوں کے ادب کو میں نے اپنی زندگی کا مرکزی نقطہ بنایا ہے۔ اس کام میں مجھے ۳۷ سال ہو گئے ہیں۔ جیسے جیسے وقت گزرتا جاتا ہے مجھے بچّوں کے ادب کی اہمیت کا احساس ہوتا جاتا ہے اور یہ احساس بھی کہ میں نے عمرِ عزیز بے کار نہیں گنوائی۔

مسعود احمد برکاتی

۱

۲۹ اگست ۱۹۸۲ء کی صبح تھی۔ کراچی کا موسم خوش گوار تھا۔ کراچی کے ہوائی اڈے پر ہزاروں مسافروں اور ان کو الوداع کہنے اور ان کا استقبال کرنے والوں کا خوب ہجوم تھا۔ ہم بھی ان مسافروں میں شامل تھے۔ جناب حکیم محمد سعید اور مجھے انگلستان اور فرانس جانا تھا۔ دو مسافر، دو ملک۔ پہلے لندن اوکسفرڈ اور کیمبرج میں اہلِ علم و دانش سے ملنا تھا، پھر پیرس جانا تھا۔ پیرس میں بھی پڑھے لکھے لوگوں ہی کی محفل میں شرکت کرنی تھی۔ پیرس سے یونیسکو کا ایک بہت ہی اچھا رسالہ کوریئر نکلتا ہے۔ یہ رسالہ اپنی قسم کا ایک ہی رسالہ ہے۔ دنیا کے بہت سے ملکوں سے نکلتا ہے۔ خوشی اور فخر کی بات ہے کہ یہ رسالہ اردو میں بھی حکومتِ پاکستان اور ہمدرد فاؤنڈیشن کے تعاون سے نکلتا ہے۔ پیرس میں اس رسالے کے ایڈیٹروں کی میٹنگ ہے۔ اس میں ہمیں شرکت کرنی ہے۔

کراچی سے پین ام کا جہاز ٹھیک مقررہ وقت پر ہوا میں بلند ہوا۔ وقت کی قدر جن قوموں نے پہچان لی ہے انھوں نے ضرور ترقی کی ہے۔ راستے بھر ہماری خاطر مدارات ہوتی رہی۔ یہ جمبو جیٹ ہوائی جہاز بہت بڑا تھا۔ معلوم ہوتا تھا کہ ہم کسی مکان میں بیٹھے ہیں اور وہ پورا مکان اُڑ رہا ہے۔ اُڑان اتنی مہارت سے تھی کہ نہ جھٹکے نہ ہچکولے۔ آرام سے بیٹھے کھاتے پیتے، پڑھتے لکھتے رہے۔ ہم جہاز کی اُوپر کی منزل میں تھے جہاں صرف دس مسافر تھے۔ آرام دہ اور بڑی نشستیں تھیں۔ خوب پیر پھیلا کر بیٹھے تھے۔ نیچے کی منزل میں ۴۰۰ مسافر تھے۔ وہاں فلم بھی دکھائی جا رہی تھی۔ میں نے وہاں جاکر تھوڑی دیر فلم بھی دیکھی۔ راستے میں استنبول آیا۔ جہاز رُکا، لیکن ہمیں اُترنے نہیں دیا گیا۔ اس وقت ہوائی میدان میں جگہ نہ تھی۔ افسوس استنبول نہ دیکھ سکا۔ پھر فرینکفرٹ رُکے۔ وہاں اُترے بھی۔ بڑا حسین ہوائی اڈا ہے۔ وہاں سے اُڑے تو لندن جا پہنچے۔ تیرہ گھنٹے میں ہم کہاں سے کہاں پہنچ گئے۔ کتنا لمبا سفر کتنی جلدی طے ہو گیا۔

اس علمی مگر دل چسپ سفر کا حال لکھتا ہوں۔ جو بات آتی جائے گی لکھتا جاؤں گا۔

تیرہ گھنٹے بعد ہم لندن پہنچ گئے۔ کتنا لمبا سفر کتنی جلدی طے ہو گیا۔ اب سے پچاس سال پہلے لندن جانا کتنا مشکل تھا۔ پانی کے جہاز میں جانا پڑتا تھا، ہفتوں لگتے تھے۔ سائنس کی ترقی نے فاصلوں کو کم، سفر کو مختصر اور آسان بنا دیا ہے۔ علم انسان کے لیے کتنا مفید ہے۔

لندن بہت بڑا شہر ہے۔ ہمارے سب سے بڑے شہر کراچی سے دُگنا تو ہو گا۔ کوئی اسّی میل کے رقبے میں پھیلا ہوا ہے، مگر انتظام بہت اچھا ہے، اس لیے وہاں کوئی پریشانی نہیں ہوتی۔ سڑکیں چوڑی اور صاف۔ کاروں کی کوئی انتہا نہیں تھی۔ کاریں خوب تیز چلتی ہیں، مگر قاعدے سے۔ سڑکوں پر کوڑا نظر نہیں آتا، نہ نالیاں اور گٹر اُبلتے ہیں۔ لندن میں کاروں کے علاوہ بسیں اور ٹیکسیاں بھی چلتی ہیں، لیکن سب سے زیادہ لوگ "ٹیوب" سے سفر کرتے ہیں۔ ٹیوب وہاں کی زیرِ زمین ریل کو کہتے ہیں جو شہر کے نیچے بنائی گئی ہے اور منٹوں میں خاصی دُور پہنچا دیتی ہے۔ شہر میں اس کے ۲۷۸ اسٹیشن ہیں۔ اسٹیشن سے بجلی کے زینوں کے ذریعہ سے اُتریے، ٹکٹ خریدیے اور ٹرین میں بیٹھ جائیے۔

لندن کا برٹش میوزیم بہت مشہور ہے جس میں دنیا بھر کی عجیب، نادر اور پُرانی چیزیں جمع ہیں۔ جن کو دیکھنے سے انسان کی پوری تاریخ سامنے آجاتی ہے۔ عقل دنگ رہ جاتی ہے۔ ماضی کا علم انسان کو اپنی حقیقت سمجھنے اور آگے بڑھنے میں مدد دیتا ہے۔ زندہ قومیں اپنی تاریخ کو اسی لیے محفوظ رکھتی ہیں۔ برٹش میوزیم کی وسیع عمارت، اس میں چیزوں کو رکھنے کا سلیقہ اور وہاں کا انتظام دیکھنے ہی سے تعلق رکھتا ہے اور اس کو پوری طرح دیکھنے کے لیے کئی دن چاہییں۔

مادام تُساد کے عجائب گھر کا نام تو آپ نے سُنا ہے۔ یہاں دنیا کے بڑے لوگوں کے مجسمے ہیں، مگر پتھر کا مجسمہ ایک بھی نہیں ہے۔ واقعی مادام تُساد کمال کی عورت تھیں۔ ادیبوں اور عالموں کے مجسمے دیکھنے سے اندازہ ہوتا ہے کہ یہ قوم اپنے محسنوں کو پہچانتی ہے اور ان کا احترام کرتی ہے۔

لندن میں جہاں اُونچی اونچی عمارتیں، دُکانیں اور بازار ہیں وہاں ہر محلّے میں پارک بھی ہیں، جہاں بچّے بڑے سب جا کر بیٹھتے ہیں اور تازہ ہوا کھاتے ہیں۔ پارکوں اور باغوں سے انسان کو تازہ ہوا ملتی ہے۔ باغ گویا شہروں کے پھیپھڑے ہوتے ہیں۔ لندن والے ہماری طرح نہیں۔ وہ باغوں کی حفاظت کرتے ہیں، پھولوں پودوں کو توڑتے نہیں، وہاں گندگی نہیں پھیلاتے۔

لندن سے ہم کیمبرج اور اوکسفرڈ گئے۔ وہاں یونی ورسٹیاں دیکھیں، لائبریریاں دیکھیں، طالب علموں کے ہوسٹل دیکھے۔ باقاعدگی، صفائی اور سکون دیکھ کر رشک آیا۔ یہ وہ درس گاہیں ہیں جہاں ہمارے بہت

سے رہنماؤں نے بھی تعلیم حاصل کی تھی۔ اوکسفرڈ اور کیمبرج میں حکیم صاحب کے دوستوں سے ملاقاتیں اور باتیں ہوئیں، جو وہاں پڑھتے ہیں یا کتابیں لکھتے ہیں۔ ان لوگوں کی نظر میں علم کی اہمیت سب سے زیادہ ہے۔ دولت، شہرت، عزّت، تجارت کا کسی کو لالچ نہیں۔ یہ اور بات ہے کہ ان کی قوم ان کو سر آنکھوں پر بٹھاتی ہے اور شہرت اور عزّت ان کے پاؤں چومتی ہے، لیکن ان کو تو بس علم حاصل کرنے کا شوق اور علم کو پھیلانے کی لگن ہے اور اس میں مگن ہیں۔

لندن کے ہائیڈ پارک کا نام آپ نے ضرور سنا ہوگا۔ اس پارک میں ہر شخص کو آزادی ہے کہ وہ وہاں جاکر جو کچھ چاہے کہے، کوئی پابندی نہیں ہے۔ اپنے خیالات کو بے دھڑک ظاہر کر سکتا ہے۔ جس کے خلاف چاہے کہے، حکومت پر تنقید کرے، سیاست پر بات کرے۔ پارک کے اندر کہی ہوئی بات پر کوئی قانون لاگو نہیں ہو سکتا۔ جس کو اپنے دل کی بھڑاس نکالنی ہوتی ہے وہ ہائیڈ پارک میں جاکر کھڑا ہو جاتا ہے۔ کچھ لوگ جمع ہو جاتے ہیں اور وہ تقریر شروع کر دیتا ہے۔ ویسے بھی انگلستان میں آزادی بہت ہے، ہر طرح کی آزادی۔ حکومت کو ٹوکنے کی آزادی، اپنے خیالات پھیلانے کی آزادی۔ اخبارات پوری طرح آزاد ہیں۔ وہ حکومت پر سخت تنقید کرتے ہیں، لیکن حکومت ان کو بند نہیں کرتی، ایڈیٹروں کو قید نہیں کرتی، ان کو غدار نہیں کہتی۔ اس لیے وہاں غلطیوں کی اصلاح جلد ہو جاتی ہے۔

۲

انگلستان میں کوئی شخص بھوکا نہیں مر سکتا۔ جب تک کوئی بے روزگار رہے اس کو وظیفہ ملتا رہتا ہے۔ علاج مُفت ہوتا ہے۔ تعلیم عام ہے، مگر مہنگائی بھی بہت ہے۔ چیزوں کی قیمتیں سُن کر ہوش اُڑ جاتے ہیں، لیکن وہاں کے لوگوں کی آمدنیاں بھی زیادہ ہیں۔

لندن میں پاکستان کے لوگ بھی بہت ہیں اور مزے سے رہتے ہیں۔ پاکستان کے جو لوگ وہاں رہتے ہیں وہ بھی وہاں کے ماحول میں ڈھل جاتے ہیں، ویسی ہی زندگی گزارتے ہیں۔ خوب محنت کرتے ہیں اور ترقی کرتے ہیں۔ آدمی محنت اُسی وقت کرتا ہے جب اُس کی قدر ہو، اس کا پورا معاوضہ ملے۔ ہمارے معاشرے میں بھی دیانت، محنت، قابلیت اور شرافت کی قدر ہونے لگے تو یہاں بھی یہی خوبیاں ترقی کریں۔

ماحول کا انسان پر بہت اثر ہوتا ہے۔ ہر انسان اپنے ماحول میں ڈھلنے کی کوشش کرتا ہے۔ ماحول اچھا ہو تو اس میں رہنے والے انسانوں کی عادتیں اور کام بھی اچھے ہوں گے۔ اچھا ماحول اس کو کہتے ہیں جس میں انسان اپنے آپ کو محفوظ سمجھے۔ اس کی جان، اس کا مال، اس کی عزت خطرے میں نہ ہو۔ جب انسان اپنے کو محفوظ سمجھے تو پھر وہ غلط کام نہیں کرتا۔ انسان اکثر بے ایمانی اس لیے کرتا ہے کہ وہ مالی لحاظ سے اپنے آپ کو محفوظ نہیں سمجھتا۔ جس انسان کی عزت کی جاتی ہے وہ غلط یا بُرے کام نہیں کر سکتا۔ لندن میں ہم نے دیکھا کہ انسان کی عزت کی جاتی ہے، اس لیے لوگ عام طور پر چوری اور کام چوری نہیں کرتے۔ وہاں کی حکومت بھی لوگوں کو دھوکا نہیں دیتی۔ ان سے جھوٹے وعدے نہیں کرتی۔ وہاں کے لوگ بھی یہ اُمید نہیں کرتے کہ حکومت جادو کے زور سے پلک جھپکتے میں سارے مسئلے حل کر دے گی۔

لندن سے کیمبرج کا شہر کوئی ستر میل دُور ہے۔ لندن شہر ختم ہونے کے بعد سڑکیں زیادہ چوڑی ہو جاتی ہیں۔ ان کو "موٹر وے" کہتے ہیں۔ ان پر بڑے آرام سے کاریں، بسیں اور دوسری سواریاں

دوڑتی ہیں۔ لوگ قاعدے اور اصول کی پابندی کے عادی ہیں، اس لیے تیز چلانے کے باوجود گاڑیاں آپس میں ٹکراتی نہیں۔ لندن میں کار چلانے والے پیدل چلنے والوں کا بڑا خیال رکھتے ہیں۔ جیسے ہی کوئی پیدل چلنے والا سڑک پار کرنے کے لیے سڑک پر قدم رکھ دے کاریں فوراً رُک جاتی ہیں اور جب تک پیدل چلنے والے دوسرے کنارے پر نہ پہنچ جائیں کاریں رُکی رہتی ہیں۔

کیمبرج کے راستے میں کئی گاؤں آتے ہیں۔ بڑی سڑک یعنی موٹروے کے دونوں طرف چھوٹی سڑکیں گاؤں کو جاتی ہیں۔ تھوڑے تھوڑے فاصلے پر بورڈ لگے ہیں، جس پر شہروں اور گاؤں کے نام اور فاصلے لکھے ہیں۔ جس طرف نظر اٹھائیے سبزہ ہی سبزہ نظر آتا ہے۔ درخت، باغ اور کھیت اس قدر خوب صورت معلوم ہوتے ہیں کہ آنکھوں میں روشنی آجاتی ہے۔ راستے میں بعض جگہ ہم نے دیکھا کہ سڑک کے کنارے چھوٹے چھوٹے کیبن رکھے ہیں، جن میں پھل اور سبزی وغیرہ رکھی ہوئی ہے۔ قیمت لکھی ہے، مگر کوئی دُکان دار نہیں ہے۔ خریدار خود ہی اپنی پسند کی چیز وہاں سے اُٹھا لیتا ہے اور لکھی ہوئی قیمت وہاں رکھ دیتا ہے۔ یہ دیکھ کر خیال آیا کہ ان لوگوں نے دنیا کو اپنے لیے جنّت بنا لیا ہے۔ جس جگہ اتنا اعتماد ہو اور اتنا اطمینان ہو، جہاں جان بھی محفوظ ہو، مال بھی محفوظ ہو اور عزّت بھی، اس کے جنّت ہونے میں کیا شبہ ہے۔

لندن، آکسفرڈ اور کیمبرج میں آٹھ دن گزار کر ہم ۵ ستمبر کو پیرس روانہ ہوئے۔ روانہ کیا ہوئے لندن کے ہوائی اڈّے ہیتھرو سے ایئر بس میں بیٹھے اور ایک گھنٹے بعد پیرس اُتر گئے۔ پیرس میں دو ہوائی اڈّے ہیں ایک چارلس ڈیگال ایئر پورٹ اور دوسرا آرلی ایئر پورٹ۔ ہم چارلس ڈیگال ایئر پورٹ پر اُترے۔ یہ ہوائی اڈّہ دیکھنے سے تعلق رکھتا ہے۔ بہت بڑا ہے اور بہت خوب صورت۔

جیسے ہی جہاز ہوائی اڈّے پر رُکا اور ہم جہاز سے نکلنا چاہتے تھے کہ اعلان ہوا "کیا پروفیسر سعید اس جہاز سے آئے ہیں؟ سفارت خانۂ پاکستان کے افسران کا انتظار کر رہے ہیں۔" ہم جہاز سے باہر آئے تو ایک فرانسیسی خاتون نے حکیم صاحب کا استقبال کیا۔ وہ خاتون اہم شخصیات کے خیر مقدم و مہمان داری کی افسر تھیں۔ ان خاتون کے علاوہ پیرس میں پاکستانی سفارت خانے کے افسر بھی موجود تھے، جو حکیم صاحب کو لینے کے لیے آئے تھے۔ ان کی وجہ سے بڑی آسانی ہوئی اور وقت بچا، لیکن میں ہوائی اڈّہ اچھی طرح نہیں دیکھ سکا، کیوں کہ ہمیں مختصر راستے سے باہر پہنچا

دیا گیا اور ہمارا سامان بھی۔ حکیم صاحب تو نہ معلوم کتنی بار پیرس دیکھ چکے ہیں، اس لیے وہ چارلس ڈیگال ایئرپورٹ بھی پہلے دیکھ چکے تھے۔ خیر میں نے بھی پیرس سے پاکستان واپسی کے وقت اس ہوائی اڈے کی خوب صورت اور بڑی عمارت اچھی طرح دیکھی۔ انتظام بھی بہت اچھا ہے۔

پیرس میں یونیسکو کے دفتر میں کوریئر کے ایڈیٹروں کی میٹنگ میں ہمیں شریک ہونا تھا۔ یہ میٹنگ ۵ روز تک ہوتی رہی۔ یونیسکو کا دفتر ایک بہت بڑی اور خوب صورت عمارت میں ہے قریب ہی ایک اور عمارت بھی ہے۔ یہ عمارت بھی خاصی کشادہ ہے۔ اب ایک تیسری عمارت اور بن رہی ہے۔ یونیسکو کا کام بھی تو بڑھتا جا رہا ہے۔ ان عمارتوں میں کارکنان اور سامان کی کثرت سے جگہ کی کمی کا اندازہ ہوتا ہے۔

یونیسکو کا رسالہ کوریئر ۲۶ زبانوں میں نکلتا ہے۔ ہر ملک اپنی زبان میں اس کو شائع کرتا ہے۔ جیسے ہم پاکستان سے اردو میں یہ رسالہ پیامی کے نام سے نکالتے ہیں، اسی طرح ہندستان سے ہندی زبان میں، جاپان سے جاپانی میں، چین سے چینی میں، ایران سے فارسی میں یہ رسالہ شائع ہوتا ہے۔ دو سال میں ایک بار تمام زبانوں کے ایڈیٹر پیرس میں جمع ہوتے ہیں اور آپس میں مشورے کرتے ہیں۔ اپنی مشکلات بتاتے ہیں۔ آیندہ کا پروگرام طے کرتے ہیں۔ اسی مقصد کے لیے ہم پاکستان سے آئے تھے۔ چناں چہ پانچ روز تک اسی میں مصروف رہے۔ میٹنگ صبح دس بجے شروع ہوتی تھی اور شام کے چھے بجے تک جاری رہتی تھی۔ بیچ میں کھانے کا وقفہ ہوتا تھا۔ حکیم صاحب وقت کے بہت پابند ہیں۔ بالکل صحیح وقت پر میٹنگ میں پہنچتے تھے۔ اس معاملے میں انھوں نے مثال قائم کر دی۔ میٹنگ میں کسی نہ کسی ایڈیٹر کو دیر ہو ہی جاتی تھی، مگر مجال ہے جو حکیم صاحب کو دیر ہو جائے۔ حکیم صاحب بولتے بھی کم ہیں، سنتے اور سوچتے زیادہ ہیں۔ میں نے دیکھا کہ میٹنگ میں بعض لوگ بہت لمبی گفت گو کرتے تھے۔ بات کو بڑھا چڑھا کر پیش کرتے تھے۔ کوئی مسئلہ ہوتا تھا تو اس کو پوری تفصیل سے اور پھیلا کر بیان کرتے، لیکن حکیم صاحب کم الفاظ میں بہت کچھ کہہ دیتے تھے۔ میٹنگ سے جو وقت بچتا وہ حکیم صاحب یونیسکو میں اپنے دوستوں سے ملنے اور ان سے مشورہ کرنے میں صرف کرتے۔ میں پیرس شہر اور وہاں کی خاص خاص چیزیں دیکھنے کی کوشش کرتا۔ پیرس بہت حسین شہر ہے۔ اس میں مشرقی انداز بھی پایا جاتا ہے۔ سڑکوں کے دونوں جانب درخت اور پھول پودے لگے ہیں۔ اگرچہ وہ پھولوں کا خاص موسم نہ تھا، لیکن پھر بھی پھول خاصے تھے۔

۳

پیرس میں ہم ہوٹل ڈ د کین میں ٹھیرے تھے۔ یہ ہوٹل یونیسکو صدر دفتر سے قریب ہی ہے اور ہم میٹنگ میں شرکت کے لیے پیدل ہی جا سکتے تھے۔ چناں چہ ہم اکثر پیدل ہی جاتے تھے۔ ایک دن میں ہوٹل میں اپنے کمرے کا دروازہ بھولے سے بند کیے بغیر باہر چلا گیا۔ کئی گھنٹے بعد واپس آیا تو کمرے کا دروازہ چوپٹ کھلا تھا۔ دل دھک سے ہو گیا کہ معلوم نہیں کیا کیا ہو گا؟ کیا کیا چیز غائب ہو گئی ہو گی، لیکن مجال ہے کہ جو ایک تنکا بھی ادھر سے اُدھر ہوا ہو۔ جو چیز جس طرح، جہاں پڑی تھی ویسی ہی ملی۔ حیرت بھی ہوئی، خوشی بھی اور رنج بھی حیرت تو چوری نہ ہونے پر ہوئی، خوشی اپنی تمام چیزیں جوں کی توں پانے پر، اور رنج اس بات کا کہ ہمارے ہاں ایسا کیوں نہیں ہوتا۔ کیا ہم اپنا گھر یا کمرا کھلا چھوڑ کر چلے جائیں تو ہمیں واپس آکر کوئی چیز باقی ملے گی؟ مگر ایسا کیوں ہے؟ ان حالات سے کون خوش ہے؟ اور جن ملکوں میں دیانت، امانت، اعتماد اور اطمینان کا راج ہے وہاں کون خوش نہیں ہے۔ سب سے اچھا معاشرہ کون سا ہے؟ میرے خیال میں وہ معاشرہ یا سوسائٹی سب سے اچھی ہے جس کا ہر آدمی بھروسے کے قابل ہو۔ جب ہر آدمی بھروسے کے قابل ہو گا تو ہر آدمی کی جان، مال اور آبرو محفوظ ہو گی اور ایمان بھی محفوظ ہو گا۔ بس اس سے بڑھ کر سکون کی بات کیا ہو گی۔

پیرس بڑا خوب صورت اور تاریخی شہر ہے۔ فرانس والوں کو اپنی تہذیب اور اپنی زبان پر بڑا ناز ہے اور وہ اس کی حفاظت اپنی جان سے زیادہ کرتے ہیں۔ دوسری بڑی جنگ میں فرانس والوں نے پیرس کو تباہی سے بچانے کے لیے ہتھیار ڈالنا گوارا کیا تھا۔ ہتھیار ڈالنا کوئی اچھی بات نہیں سمجھی جاتی۔ ہار جیت تو ہوتی ہی رہتی ہے۔ جب لڑائی ہوتی ہے تو دونوں میں سے ایک فریق تو ہارتا ہی ہے۔ دونوں تو جیتنے سے رہے۔ ہارنے کے بعد ہار کو نہ ماننا بھی اچھی بات نہیں ہے، بلکہ ہار کو کھلے دل کے ساتھ تسلیم کر لینا بہادری اور خوبی مانی جاتی ہے، لیکن جنگ میں ہار سے زیادہ ہتھیار

ڈال دینے کو بُزدلی سمجھا جاتا ہے، لیکن اپنی تہذیب کو بچانے کے لیے فرانس نے ہتھیار ڈالنے کی ذلّت بھی گوارا کی۔ فرانس والوں نے سوچا کہ ہماری تہذیب اور تاریخ کا مرکز اور خزانہ پیرس ہے۔ اگر یہ شہر تباہ ہو گیا تو ہماری تہذیب تباہ ہو جائے گی اور گویا ہم تباہ ہو جائیں گے، اس لیے پیرس کو بچانا چاہیے۔ ہتھیار ڈالے بغیر پیرس کو بچانا ممکن نہیں تھا، اس لیے ہتھیار ڈالنے کا فیصلہ کیا گیا۔ اپنی تہذیب کی محبّت میں یہ سُبکی برداشت کی۔ جو چیز عزیز ہو اس کے لیے قربانی دینی ہی پڑتی ہے۔ محبّت سُبکی بھی گوارا کرا دیتی ہے۔

ہر بڑے شہر کی طرح پیرس میں بھی فاصلے بہت طویل ہیں۔ ویسے تو بسیں، موٹریں، ٹیکسیاں اور میٹرو (METRO) سب کچھ موجود ہے اور وہاں کے لوگ ضرورت کے مطابق اور حیثیت کے مطابق سواری استعمال کرتے ہیں، لیکن سیاحوں اور مسافروں کو تھوڑی سی الجھن پیش آتی ہے۔ ٹیکسیاں مل جاتی ہیں، مگر مہنگی پڑتی ہیں۔ فرانس کے سکّے کا نام فرانک ہے۔ سوئٹزر لینڈ میں بھی فرانک چلتا ہے، اس لیے فرانس کے سکّے کو فرینچ فرانک کہتے ہیں اور سوئٹزر لینڈ کا سکّہ سوئس فرانک کہلاتا ہے۔ فرانس کا فرانک ہمارے پاکستانی رُپے سے دُگنے سے کچھ کم ہوتا ہے۔ ٹیکسی میں بیٹھیے تو جس طرح کراچی میں ٹیکسی کا میٹر دو رُپے سے شروع ہوتا ہے، پیرس میں آٹھ فرانک سے شروع ہوتا ہے۔ گویا پاکستان کے کوئی ۱۵ رُپے ہوئے۔ اس کے بعد کا حساب میری سمجھ میں نہیں آیا کہ یہ آٹھ فرانک کتنے میل یا کیلومیٹر تک چلتے ہیں۔ میں کئی بار ٹیکسی میں بیٹھا۔ جہاں اُترنا تھا وہاں تک جتنے فرانک میٹر نے دکھائے وہ ادا کیے اور اُتر گیا۔

پیرس کے ٹیکسی والے کیسے ہوتے ہیں؟ اچھے ہوتے ہیں بس ایسے ہی جیسے ہمارے ہاں کے ٹیکسی والے۔ اندازہ ہوا کہ ٹیکسی والے شاید ساری دنیا میں ایک ہی برادری سے تعلق رکھتے ہیں۔ میں ایک شام پیرس کے سب سے خوب صورت بازار "شانزالیزے" میں تھا کہ مجھے یاد آیا کہ یونیسکو کے قریب ایک دُکان سے بال پن خریدنے ہیں۔ یہ بال پن ربر کی نلکیوں کے بنائے گئے ہیں اور آسانی سے مُڑ جاتے ہیں۔ چاہو تو ہاتھ میں کڑا بنا کر بھی پہن لو، تاکہ کھو جانے کا خطرہ نہ رہے۔ محترم حکیم محمد سعید صاحب کو بھی یہ پسند آئے ہیں۔ پیرس میں بازار عام طور پر چھے بجے تک بند ہو جاتے ہیں۔ مجھے خیال ہوا کہ کہیں وہ دُکان میرے پہنچتے پہنچتے بند

نہ ہو جائے، اس لیے جلدی پہنچنا چاہیے، لیکن شام کا وقت تھا۔ جو ٹیکسی سامنے سے گزرتی بھری ہوئی ہوتی۔ ہر ٹیکسی کو اُمید و اشتیاق کی نگاہوں سے دیکھتا اور پھر خالی نہ پاکر مایوس ہو جاتا۔ ایک ٹیکسی خالی نظر آئی۔ "شانزالیزے" کا بازار رنگین اور بارونق ہونے کے علاوہ کشادہ بھی ہے۔ وہ ٹیکسی اس کشادہ سڑک کے درمیان میں چلی آرہی تھی اور ٹیکسی والا میری آواز پر کان نہیں دھر رہا تھا کہ سگنل کی وجہ سے اس کو رُکنا پڑا اور میں خطرہ مول لے کر دوڑتا ہوا اس کے پاس بیچ سڑک پر پہنچا کہ بھائی، یونیسکو پہنچادو، تو اس نے بڑی اُونچی اور بھاری آواز میں کہا، "نہیں آرلی"۔ یعنی اگر آرلی ایئر پورٹ چلنا ہو تو چلو۔ خیر صاحب، خدا خدا کرکے ایک ٹیکسی ملی تو اس نے بھی یونیسکو کے پاس جہاں جانا چاہتا تھا وہاں نہیں پہنچایا بلکہ روکتے روکتے بھی خاص یونیسکو کی عمارت کے احاطے میں لے جاکر ٹیکسی روک دی اور اس کے بعد بڑے اطمینان سے میٹر بند کر دیا۔ چناں چہ مجبوراً وہاں سے پیدل بال پن کی دُکان تک جانا پڑا۔

پیرس میں ٹیکسیاں عورتیں بھی چلاتی ہیں اور بڑے اعتماد سے چلاتی ہیں۔ ان کے انداز بھی مردانہ ہی سے ہوتے ہیں۔ ویسے فرانسیسی مرد بھی ڈرائیونگ میں بعض وقت ذرا کم زور اعصاب کا ثبوت دیتے ہیں اور کوئی مشکل پیش آجائے تو گھبرا جاتے ہیں۔ بعض ٹیکسی والے اپنی ٹیکسی میں سگرٹ نہیں پینے دیتے اور کہہ دیتے ہیں کہ اگر ٹیکسی میں بیٹھنا ہے تو سگرٹ پھینک دو۔

البتہ پیرس کے کسی ٹیکسی والے نے مجھ سے میٹر سے زیادہ پیسوں کا مطالبہ نہیں کیا۔ جتنے پیسے میٹر نے بتائے خوشی خوشی قبول کر لیے۔ یہ تجربہ تو ایک بار لندن ہی میں ہوا تھا۔ میں ورکٹوریا کے علاقے سے ڈریک فیلڈ روڈ پر جانا چاہتا تھا جہاں ہم جناب سید یوسف حسین نقوی کے ہاں ٹھہرے ہوئے تھے، ٹیکسی کے میٹر نے پانچ پونڈ بنائے۔ ڈرائیور نے کہا، "دس پونڈ دو"۔ خیر میں تو چھے پونڈ دے کر ٹیکسی سے اُتر گیا۔ اس نے بھی زیادہ اصرار نہیں کیا۔

ٹیکسی کے علاوہ مسافروں کے لیے پیرس میں دوسرا ذریعہ "میٹرو" ہے۔ یہ میٹرو پولیٹین کا مخفف ہے اور پیرس کی زیرِ زمین (انڈر گراؤنڈ) ریلوے کا نام ہے۔ کہتے ہیں کہ یہ لندن کی "ٹیوب" سے بھی پرانی ہے اور اس صدی کے آغاز سے جاری ہے۔ پیرس میں بھی اس کا

انتظام بہت اچھا ہے۔ لندن اور پیرس دونوں شہروں میں زیرِ زمین ریل شہریوں کی بڑی خدمت انجام دیتی ہے۔ بجلی سے چلنے والی یہ ریلیں بڑی تیزی سے چلتی ہیں اور منٹوں میں دُور دُور پہنچا دیتی ہیں۔ آرام دہ بھی ہیں اور سستی بھی۔ جن لوگوں کے پاس کاریں ہیں وہ بھی میٹرو میں آتے جاتے ہیں۔ ایک تو پٹرول بچتا ہے جو بہت مہنگا ہے، دوسرے سڑکوں پر ہجوم کی وجہ سے کار میں بھی خاصا وقت لگ جاتا ہے۔ میٹرو کے لیے راستہ صاف ہوتا ہے لیکن میرے خیال میں ان دونوں کے علاوہ یہ سبب بھی ہے کہ ان شہروں کے لوگ کار کو آرام اور سہولت کے لیے اور وقت کی بچت کے لیے استعمال کرتے ہیں، شان وشوکت کے لیے "کارنشین" نہیں بنتے۔ ترقی یافتہ ملکوں میں ایسا بھی ہوتا ہے کہ جن لوگوں کے پاس کار ہے، اُن کے پاس سائکل بھی ہے۔ قریب جانا ہو تو وہ سائکل پر جاتے ہیں۔ اس سے بھی قریب ہو تو اپنی ٹانگیں استعمال کرتے ہیں اور پیدل جاتے ہیں۔ اس طرح وہ سُست بھی نہیں ہونے پاتے اور اُن کی صحت بھی ٹھیک رہتی ہے۔ ہمارے ہاں تو اکثر اہلِ کار محلّے کی دُکان پر بھی "بے کار" نہیں جاتے اور ان کی کاہلی اور شان دونوں میں اضافہ ہوتا رہتا ہے۔

شہروں کی آبادیاں بے تحاشا بڑھتی جا رہی ہیں۔ ایک تو قدرتی طور پر آبادی میں اضافہ ہو رہا ہے، دوسرے گاؤں، قصبوں اور چھوٹے شہروں سے بھی لوگ آ کر شہروں میں بس رہے ہیں۔ صنعتی ترقی کی وجہ سے قصبوں کے مقابلے میں شہروں میں روزگار آسانی سے مل جاتا ہے۔ یوں شہر پھیلتے جا رہے ہیں۔ اسی کو "شہراؤ" (URBANIZATION) کہتے ہیں۔ ترقی یافتہ ملک اور اچھی حکومتیں شہراؤ سے جو مسائل پیدا ہوتے ہیں اُن کو خوب سمجھتی ہیں اور اُن کو حل کرنے کے لیے منصوبے بناتی ہیں۔ پاکستان میں بھی شہراؤ شروع ہو چکا ہے، خاص طور پر کراچی کی آبادی تیزی سے بڑھتی جا رہی ہے۔ دیکھتے ہی دیکھتے کراچی میں انسانوں کا سمندر ٹھاٹھیں مارنے لگا۔ ہر طرف آبادی ہی آبادی نظر آنے لگی۔ کچھ ہی دن جاتے ہیں کہ شہر کراچی کی آبادی کروڑ تک جا پہنچے گی، لیکن اسی کے ساتھ شہروں کی مشکلات اور پریشانیاں بھی بڑھ رہی ہیں۔ پانی، بجلی اور آمدورفت کے علاوہ صحت کا مسئلہ سنگین صورت اختیار کرتا جا رہا ہے۔

آمد و رفت کی تکلیف ہر شہری کی زندگی کا ایسا تجربہ بن گئی ہے جس کو بھلانا آسان نہیں ہے۔ سرکلر ریلوے نواحی بستیوں اور مضافات کے رہنے والوں کے لیے ایک حد تک سہارا ہے، لیکن بسوں کا انتظام اتنا خراب ہے کہ جب تک انتظام کرنے والے خود بس میں آیا جایا نہ کریں اُن کو صحیح اندازہ نہیں ہو سکتا، لیکن وہ تو کاروں میں اُڑے پھرتے ہیں اور عام شہری بسوں کے پیچھے دوڑتا پھرتا ہے۔ جن لوگوں کے بس میں تھا انھوں نے کاریں خرید لی ہیں، بس میں نہیں بھی تھا تو ناجائز طریقے سے بس میں کر لیا اور "بس" سے بچ گئے۔ جو لوگ بالکل بے بس ہیں وہ مستقل عذاب بھگت رہے ہیں، لیکن کراچی کی سڑکیں اب اور زیادہ سواریاں (ٹریفک) برداشت نہیں کر سکتیں۔ اگر کوئی شریف آدمی اس مسئلے کو حل کرنا ہی چاہتا ہے تو وہ بسوں کا انتظام صحیح کرے اور زیرِ زمین ریل کے لیے منصوبہ بنائے۔

بات یہ ہے کہ کراچی میں بہت سے ایسے لوگوں کو بھی کاریں یا اسکوٹر رکھنی پڑتی ہیں، جن کو عام طور پر گھر سے دفتر اور دفتر سے گھر جانا آنا پڑتا ہے، زیادہ نہیں دوڑنا پڑتا۔ اگر پبلک ٹرانسپورٹ کا انتظام صحیح ہو اور آدمی عزت کے ساتھ بس میں جا سکے تو اس کو اپنی ذاتی کار رکھ کر سڑکوں پر ہجوم اور پٹرول کا خرچ بڑھانے کی ضرورت نہیں ہے۔ لندن اور پیرس اتنے بڑے شہر ہیں، لیکن وہاں اچھے انتظام کی وجہ سے لوگوں کو پریشانی نہیں ہوتی۔ وہاں کے شہری بھی اپنا فرض پہچانتے ہیں اور انتظام صحیح رکھنے میں حکومت کی مدد کرتے ہیں۔

لندن اور پیرس میں ٹیکسیوں کے کھڑے ہونے کے لیے باقاعدہ جگہ مخصوص ہوتی ہے۔ بورڈ لگا ہوتا ہے۔ وہاں جائیے، ٹیکسی کھڑی ہو گی یا کچھ دیر بعد آجائے گی۔ اگر شام کا وقت ہے اور آدمی زیادہ جمع ہو گئے تو سب صف بنا کر کھڑے ہوں گے اور جیسے جیسے ٹیکسیاں آئیں گی باری باری بیٹھتے جائیں گے۔ ہوٹل والے فون کر کے ہوٹل پر بھی ٹیکسی منگوا دیتے ہیں۔ مجھے بھی پیرس سے روانہ ہوتے وقت ہوٹل ڈوکین نے ایئرپورٹ آنے کے لیے ٹیکسی منگوا دی تھی۔

۴

ہوٹل ڈوکین والوں نے ٹیکسی منگا دی اور یہ بھی بتایا کہ تقریباً اسی وقت ایک لیڈی کو بھی ایئرپورٹ پہنچنا ہے۔ اگر آپ ساجھا کرنا چاہیں تو اس کو بھی ساتھ بٹھا لیں۔ ٹیکسی کا کرایہ دونوں آدھا آدھا دے دیں کفایت ہو جائے گی۔ میں نے سوچا کہ کیا حرج ہے۔ ہوٹل سے ہوائی اڈے کا فاصلہ بہت ہے۔ ٹیکسی کا کرایہ بھی بہت بنے گا، بلکہ ایسا محسوس ہوا کہ منھ مانگی مُراد ملی اور میں نے ہاں کہہ دی۔ ایک صورت یہ بھی ہو سکتی تھی کہ ہوٹل سے ٹیکسی میں اس بس اسٹینڈ تک جاؤں جہاں سے ہوائی اڈے کو بسیں جاتی ہیں۔ حکیم صاحب مرحوم نے یہ ترکیب بھی اپنے تجربے کی بنا پر بتا دی تھی، کیوں کہ حکیم صاحب تو ساری دنیا کی سیاحت کر چکے ہیں اور پیرس بھی نہ معلوم کتنی بار آ چکے ہیں، لیکن مجھے بسوں میں سفر کرتے ہوئے اُلجھن ہی ہوتی ہے۔ شاید بسوں کا ٹھیر ٹھیر کر چلنا اور رُک رُک کر بڑھنا کھلتا ہے اور اپنی آزادی میں فرق آتا ہے۔ بہرحال میں نے ہوٹل والوں کی تجویز قبول کر لی۔ راستے میں پُل پر پُل آنے شروع ہوئے تو میں نے اس خاتون سے جو انگریز تھی، پوچھا کہ کتنے پُل آئیں گے راستے میں؟ تو اس نے ٹیکسی ڈرائیور سے پوچھ کر بتایا کہ ۲۲ پُل۔ خاتون نے ڈرائیور سے فرانسیسی میں بات کی تھی، اس لیے میں نے پوچھا کہ آپ تو فرانسیسی اچھی جانتی ہوں گی۔ انگریز خاتون نے کہا کہ سیکھی تو ہے، لیکن کسی زبان کو جب تک بولتے نہ رہو یاد نہیں رہتی، مجھے بھی فرانسیسی بولنے کا کم موقع ملتا ہے، اس لیے زیادہ اعتماد نہیں ہے۔ اس نے بڑے نُکتے کی بات کہی تھی۔ جس زبان کو استعمال نہ کرو اس میں مہارت حاصل کرنا بہت مشکل ہوتا ہے۔

فرانس کے لوگ اپنی زبان فرانسیسی سے بہت محبّت کرتے ہیں۔ وہ اپنی زبان ہی بولنے لکھنے میں فخر سمجھتے ہیں۔ پیرس میں ہم نے ہر جگہ فرانسیسی ہی لکھی دیکھی اور جس سے بات کی وہ اپنی زبان میں شروع ہو گیا۔ کسی راہ چلتے سے راستہ پوچھا اور اس نے فرانسیسی میں جواب

دیا تو میں نے کہا بھی کہ میں فرانسیسی نہیں جانتا، مہربانی کرکے انگریزی میں بات کیجیے، مگر یہ بات بھی میں انگریزی ہی میں کہتا تھا، اس لیے وہ میری یہ بات بھی نہیں سمجھتے تھے اور اپنی فرانسیسی جاری رکھتے تھے، یہاں تک کہ اُن کا شکریہ لفظوں کے بجائے اشاروں سے اور گردن جُھکا کر کرتا اور چلا آتا۔

پیرس کے سفر سے ایک تجربہ یہ بھی ہوا کہ جس ملک میں جاؤ، اس ملک کی زبان سیکھ کر جاؤ۔ زبان جانے بغیر نہ سیرو تفریح کا مزہ آتا ہے اور نہ وہاں کے لوگوں کو اچھی طرح سمجھا جا سکتا ہے۔ ایک لطیفہ سُن لیجیے۔

ایک صاحب نے اپنے دوست سے یہ شیخی بگھار دی کہ مجھے عربی زبان آتی ہے۔ ان کے دوست نے کچھ اور لوگوں سے یہ بات کہہ دی، اب ہوا یہ کہ ان دوستوں نے ان کی دعوت کی۔ چناں چہ شیخی خورے صاحب پریشان ہوئے کہ دعوت میں اُن کی پول کھل جائے گی، لیکن انھوں نے اپنے ایک عربی جاننے والے دوست سے کہا کہ مجھے ابھی دعوت میں جانا ہے، مجھے تھوڑی بہت عربی سکھا دو۔ دوست نے کہا کہ ذرا سی دیر میں کوئی زبان آتی ہے، خاص طور پر عربی تو مشکل زبان ہے، مگر ان صاحب کا اصرار جاری رہا کہ کچھ نہ کچھ تو بتا ہی دو تو اُن عربی داں دوست نے کہا کہ اچھا ایک اصول یہ سمجھ لو کہ عربی میں لفظ کے پہلے حروف پر اکثر پیش ہوتا ہے۔ ان صاحب نے خوش ہو کر کہا کہ بس کام بن گیا، اب میں نبھا لوں گا۔ چناں چہ وہ خوشی خوشی دعوت میں پہنچے اور پہنچتے ہی جو لوگ وہاں بیٹھے ہوئے تھے اُن کو مخاطب کرکے بڑے زور سے کہا،

"اُسّلام علیکم"

فرانس یا جس ملک میں جانا ہو وہاں کی زبان آتی ہو تو سفر زیادہ کام یاب رہتا ہے اور اجنبی لوگوں سے بھی ملنے میں زیادہ دقّت نہیں ہوتی۔ یونیسکو میں تو ہر ملک کے لوگ کام کرتے ہیں اور فرانس کے تعلیم یافتہ لوگ بھی انگریزی سے واقف ہیں، اس لیے وہاں پڑھے لکھے لوگوں سے تو گفت گو کرنے میں دقّت نہیں ہوتی، لیکن بازاریں اور عام لوگوں سے گُھلنے ملنے میں دشواری پیش آتی ہے۔

پیرس کے دُکان دار بھی بہت تھوڑی انگریزی جانتے ہیں اور بعض چھوٹی دُکان والے

تو بالکل نہیں جانتے۔ اشاروں سے ہی کام چلانا پڑتا ہے۔

یونیسکو میں کوریئر کے ایڈیٹروں کی میٹنگ کے دوران تو یہ انتظام تھا کہ کوئی انگریزی کے علاوہ کسی اور زبان میں بات کرتا تو ساتھ ساتھ اس کا ترجمہ بھی انگریزی زبان میں ہوتا رہتا تھا، جو کان پر آلہ لگا کر ہم سُن سکتے تھے۔ میٹنگ میں چینی ایڈیشن کے شریک مُدیر میرے برابر بیٹھے تھے۔ ان کا نام تھا زِن جی پین صاحب۔ بڑے عمدہ آدمی ہیں۔ ان سے باتیں ہوئیں تو معلوم ہوا کہ ہندُستان میں چار سال رہ چکے ہیں اور علی گڑھ یونی ورسٹی میں پڑھا ہے۔ میں نے کہا کہ پھر تو صاحب، آپ اردو خوب جانتے ہوں گے، تو بولے کہ ہاں تھوڑی بہت اردو جانتا ہوں، مگر وہ دراصل انکساری کر رہے تھے۔ ان کو اچھی اردو آتی ہے۔ انھوں نے مجھے اپنے نام کا انگریزی کارڈ دیا تو میں نے انھی کے قلم سے اس پر اردو میں بھی نام لکھوالیا۔

کوریئر کے چینی ایڈیشن کی ایڈیٹر ایک خاتون شین گوفین صاحبہ ہیں۔ وہ بھی اچھی انسان معلوم ہوئیں۔ سادہ مزاج اور کم گو تھیں۔ سادہ مزاج ہونا بھی اکثر بڑے ہونے کا ثبوت ہوتا ہے۔ سادہ مزاج عام طور پر سادہ لباس بھی ہوتے ہیں۔ چین ہمارا بڑا اچھا دوست ہے۔ اس کے اکثر لوگوں کو سادہ مزاج ہی دیکھا۔ سادگی بہت ہی بڑی خوبی ہے۔ یہ خوبی انسان میں دوسری بہت سی خوبیاں پیدا کرتی ہے۔ بہت سی برائیوں اور نقصانات سے بچاتی ہے۔ انسان کو دوسروں کے سامنے جُھکنے پر مجبور نہیں کرتی۔ اس کی خودی کو زخمی نہیں کرتی۔ سادہ مزاج قومیں بھی دوسری قوموں کے احسان اور ان کی امداد سے محفوظ رہتی ہیں۔

پیرس کی میٹنگ میں جناب کرشنا گوپال بھی اردو بولنے والے ملے۔ ہندی ایڈیشن کے ایڈیٹر ہیں۔ یو۔ پی کے ہیں۔ اردو خوب بولتے ہیں۔ یہ بھی بڑے انکسار سے اور آگے بڑھ کر ملتے ہیں۔ ایسا آدمی بہت جلد دوست بنا لیتا ہے۔ پیرس میں ان سے اور چین کے زِن جی پین سے مل کر بہت خوشی ہوئی۔ دونوں اردو جانتے تھے۔ اردو جاننے والے مجھے بہت اچھے لگتے ہیں۔ خاص طور پر وہ لوگ جن کی مادری یا قومی یا علاقے کی زبان تو کوئی اور ہوتی ہے، لیکن وہ اردو بولتے ہیں تو اُن کے منھ سے اردو بہت اچھی معلوم ہوتی ہے۔ ویسے پیرس میں تو فرانسیسی سنتے سنتے اور لکھی ہوئی دیکھتے دیکھتے یہ حال ہو گیا تھا کہ انگریزی بھی اپنی

مادری زبان کی طرح یاد آنے لگی تھی اور کوئی انگریزی جاننے بولنے والا مل جاتا تو ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے یہ ہماری قومی زبان بول رہا ہے۔

ہندُستان سے رسالہ کوریئر کے دو ایڈیشن نکلتے ہیں۔ ایک ہندی میں، ایک تامل میں۔ تامل کے ایڈیٹر جناب محمد مصطفٰے ہیں۔ وہ بھی میٹنگ میں شریک تھے۔ مخلص اور باعمل آدمی ہیں۔ اپنی مادری زبان تامل اور انگریزی جانتے ہیں۔ مدراس سے آئے تھے۔ میں بے اختیار اُن سے اردو میں بات کرنے لگا، مگر انھوں نے بتایا کہ وہ اردو نہیں جانتے۔ انھوں نے اسلام کے موضوع پر جناب اے۔ کے بروہی کی ایک انگریزی کتاب کی فرمائش کی۔ حکیم صاحب نے فرمایا کہ پاکستان پہنچ کر یہ کتاب آپ کو بھجوادیں گے۔

کوریئر کے مدیر اعلا موسیو ایڈورڈ گلیساں کی طرف سے میٹنگ میں شریک مدیروں کے اعزاز میں عصرانہ ہوا۔ وہاں عصرانہ کیا ہوتا ہے، کاک ٹیل پارٹی ہوتی ہے، یعنی رنگارنگ شرابوں کی دعوت۔ کچھ کھانے کو بھی ہوتا ہے، ظاہر ہے کہ ہمارا سہارا تو یہی چیزیں ہوتی ہیں۔ چناں چہ حکیم صاحب اور میں باتوں اور پانی کے گلاسوں سے پیٹ بھرنے لگے۔ کرشنا گوپال صاحب اور محمد مصطفٰے صاحب بھی ہماری ہی ٹکڑی میں شامل تھے۔ فرانسیسی یا یونیسکو سے وابستہ دو ایک اور لوگ بھی مہمان نوازی کے طور سے ہمارے ساتھ آ گئے۔ کوئی اچھی ڈِش مثلاً بادام، مونگ پھلی قسم کی چیز سامنے آتی تو چند دانے منھ میں ڈال لیتے۔ یونیسکو میں حکیم صاحب کے دوست اور ملاقاتیوں کی کمی نہیں۔ اس پارٹی میں کوریئر کے اسٹاف کے علاوہ یونیسکو کے دوسرے شعبوں کے لوگ بھی تھے۔ جیسے جیسے ان کی نظریں حکیم صاحب پر پڑتی گئیں وہ بھی حکیم صاحب سے دعا سلام کرنے آتے گئے۔ اب گویا دو ٹکڑیاں ہوگئیں۔ ایک حکیم صاحب کے گرد جمع لوگوں کی، اور ایک اُن لوگوں کی جنھوں نے مدیر اعلا کو گھیر رکھا تھا خوب باتیں ہونے لگیں۔ محفل گرم ہوگئی۔

یہ بات تو اب عام ہوگئی ہے کہ لوگ دعوتوں اور پارٹیوں میں کھانے پینے میں تکلف نہیں کرتے۔ کہنے سننے کی ضرورت نہیں ہوتی، بلکہ مہمان خود آگے بڑھ کر اپنی مدد آپ کرتے ہیں اور خوب کرتے ہیں۔ اب پرانی تہذیب کا سا مسئلہ نہیں رہا کہ میزبان بار بار کہے، اصرار کرے۔ اب تو اِدھر میزوں پر کھانا چُنا گیا اُدھر لوگ ٹوٹ پڑے۔ جو لوگ ذرا بھیڑ سے گھبراتے ہیں، وہ پیچھے اور بھوکے رہ جاتے ہیں۔

۵

پیرس پہنچنے سے پہلے خیال تھا کہ وہاں خوب سردی ہوگی اور معلوم نہیں ہمارے کپڑے سردی کا ساتھ دے سکیں گے یا نہیں۔ لندن سے پیرس کے لیے ایئر فرانس کی ایئر بس میں بیٹھے تو لندن کے ہتھرو ہوائی اڈے پر بارش ہو رہی تھی۔ گھنٹا بھر سے بھی کم میں پیرس کے چارلس ڈیگال ایئر پورٹ پر جا اُترے۔ جُھٹ پٹا ہونے لگا تھا۔ پاکستانی سفارت خانے کی گاڑی میں سیدھے ہوٹل ڈوکین پہنچے۔ تھوڑی دیر میں نہا دھو کر میں حکیم صاحب کے کمرے میں پہنچا۔ مُدیرانِ کوریئر کی میٹنگ دوسرے دن صبح دس بجے شروع ہونے والی تھی۔ توقع تھی کہ اس کے کاغذات ہمیں پیرس پہنچتے ہی ہوٹل میں مِل جائیں گے، کیوں کہ حکیم صاحب نے بتایا کہ اس سے پہلے یہی ہوتا رہا ہے کہ اُن کا فائل جس میں میٹنگ سے متعلقہ ضروری کاغذات اور پیش نامہ (ایجنڈا) وغیرہ ہوتا ہے، ایک دن پہلے کوریئر کے دفتر کی طرف سے ہوٹل میں پہنچا دیا جاتا ہے، لیکن اس بار کوئی فائل نہیں ملا۔ خیر ہم نے اپنے فائلوں سے ہی ذہن کو تازہ کیا۔ حکیم صاحب کو تو خوب تجربہ ہے، اس لیے وہ فکرمند نہیں ہوئے۔ انتظام کی خرابی پر البتہ تعجب ہوا۔

میٹنگ کی جگہ بھی بدل گئی تھی، جس کی اطلاع ٹیلکس کے ذریعہ سے کراچی پہنچی تھی، لیکن ہم روانہ ہو چکے تھے اور لندن میں تھے، اس لیے سعدیہ بیگم سلمہا نے کراچی سے لندن فون پر بتا دیا تھا کہ اب میٹنگ یونیسکو کی نئی عمارت میں ہوگی، خیر یہ عمارت بھی بہت دُور نہیں ہے۔

حکیم صاحب نے فرمایا کہ چلیے آپ کو کہیں سے کچھ کھلا لاؤں، کیوں کہ آج اتوار ہے اور ہوٹل ڈوکین میں کھانے کو کچھ نہیں ملے گا۔ شیروانی پہن کر ساتھ ہولیا۔ تھوڑی دُور پیدل چل کر ہی ریسٹورانوں کی رونق شروع ہوگئی۔ ہر ریسٹوران بھری ہوئی تھی، کچھ لوگ اندر تھے اور کچھ لوگ باہر فُٹ پاتھ پر لگی ہوئی میز کرسیوں پر بیٹھے کھانے پینے میں مصروف تھے۔ کھانے سے زیادہ پینا نظر آیا۔ فُٹ پاتھ پر ریسٹورانوں کی میز کرسیاں لگی ہونا پیرس میں عام ہے، لیکن ہمارے ہاں کی طرح وہاں یہ چیز ناگوار نہیں ہوتی۔ گندگی بھی نہیں ہوتی، کیوں کہ وہاں دھول تو اُڑتی نہیں ہے اور نہ لوگ فُٹ پاتھ پر پانی ڈالتے ہیں، نہ کُوڑا

پھینکتے ہیں۔ میں یہ سوچتا رہا کہ ہم جب گندگی کو اس اطمینان سے قبول کیے ہوئے ہیں تو ہمارا نصف ایمان کہاں گیا۔ جب ہمارے نبیؐ نے صفائی کو آدھا ایمان فرمایا ہے تو ہم صفائی سے اتنی دُور رہ کر ایمان سے کیسے قریب ہو سکتے ہیں۔

ہم نے کوئی آدھ میل پھر کر بہت سے ریسٹورانوں پر نظر ڈالی، کچھ عقل نے کام نہیں کیا۔ کہاں بیٹھیں۔ آخر ایک ریسٹوران میں بیٹھ ہی گئے۔ بیرا آیا تو مینو منگوایا۔ بہت کم سمجھ میں آیا۔ انگریزی میں بھی لکھا تھا، لیکن کھانوں کے نام تو سمجھ سے بالاتر تھے۔ بہرحال تلاش کر کرا کر "اسپیگیٹی" ڈھونڈ نکالی۔ بیرے کو بتایا کہ صرف ایک پلیٹ چاہیے تو اس نے کہا، "اور؟" ہم نے کہا، "بس!" اس نے کہا کہ "ایک پلیٹ میں دو آدمی کیسے کھائیں گے، اور صرف ایک ڈش؟" میں نے بہت سمجھایا کہ صرف ایک ہی آدمی کھائے گا، کیوں کہ حکیم صاحب کو کھانا ہی نہیں تھا، وہ تو صِرف مجھے کھِلانے لائے تھے۔ حکیم صاحب تو کھانے کے معاملے میں بہت ہی احتیاط کرتے ہیں۔ ہر جگہ نہیں کھاتے، ہر چیز نہیں کھاتے۔ ذرا سی اونچ نیچ ہو تو فاقہ کر ڈالتے ہیں۔ بیرا یہ ساری نزاکت کیسے سمجھتا۔ اس نے سمجھنے سے صاف انکار کر دیا۔ وہ "مُنکر" ہوا تو ہم بھی "باغی" ہو گئے۔ میں نے حکیم صاحب سے کہا کہ کھانا ایسا کیا ضروری ہے، اگر آج میں بھی آپ کی تقلید کر لوں اور پانی پی کر سو جاؤں تو کیا حرج ہے، کیوں کہ یہ بھی نہیں معلوم کہ یہ جو چیز لائے گا وہ کیا ہو گی۔ چناں چہ ہم کچھ کھائے بغیر ہی اُٹھ گئے۔ گلاس بھی نہیں توڑا جو چھے آنے دینے پڑتے۔

کراچی میں ایک لطیفہ مشہور ہے۔ دو آدمی کسی چھوٹے سے ہوٹل میں چائے پینے گئے۔ چائے پینے سے پہلے ہی ان کے ہاتھ سے ہوٹل کا گلاس ٹوٹ گیا۔ ان کے پاس پیسے کم تھے، سستا زمانہ تھا۔ انھوں نے سوچا کہ گلاس کے پیسے دینے پڑیں گے۔ ہمارے پاس پیسے کم ہیں، اس لیے چائے پیے بغیر ہی اُٹھ گئے۔ کاؤنٹر پر پہنچے تو بیرے نے آواز لگائی:

"کھایا پیا کچھ نہیں، گلاس توڑا، چھے آنے، چھے آنے۔"

حکیم صاحب کے ساتھ ہوٹل تک واپس گیا، وہ اپنے کمرے میں داخل ہوئے تو میں اُلٹے قدم بازار کی طرف پھر دوڑا۔ قریب ہی ایک بیکری ڈھونڈ لی۔ وہاں سے ایک لکڑی نما ڈبل روٹی خرید لی۔ پیسے دینے کے لیے اشارے بازی سے کام نہ چلا تو بیکری والی سے کہا کہ کاغذ پر رقم لکھ دو۔ اس کو منھ مانگی قیمت دی۔ اگرچہ اس نے منھ سے نہیں مانگی تھی بلکہ پنسل سے کاغذ پر لکھا تھا۔ پیرس کی ڈبل روٹی

کا کیا کہنا۔ ساری دنیا میں ایسی روٹی نہیں ہوتی۔ روکھی بھی کھاؤ تو مزہ آجاتا ہے۔ چناں چہ کھائی۔ روٹی کا مزہ بھی لیا اور مسافرت کا بھی، گویا ڈبل روٹی نے ڈبل لطف دیا۔

ہاں تو موسم کی بات رہ گئی۔ توقع کے خلاف سردی نہیں تھی، بس کراچی کا سا موسم تھا۔ جیسا یہاں مارچ میں ہوتا ہے، بلکہ رات کو کمرے کا دروازہ بند کرنے کے بعد تو ناگواری ہونے لگی اور میں نے کُرتے پاجامے میں ہی نیچے جاکر کاؤنٹر پر بیٹھے ہوئے جوان سے پوچھا کہ کیا ہیٹر چلا رکھا ہے؟ اس نے کہا کہ نہیں۔ خیر میں تھوڑی دیر ہوٹل سے باہر فُٹ پاتھ پر کھڑا ہو گیا اور ذرا کھلی فضا کا لُطف لینے لگا۔ باہر بھی اگرچہ مزے دار ہوا اور فرحت نہیں تھی۔ بادلوں کے گالے اِدھر سے اُدھر آوارہ گردی کر رہے تھے۔ ان کی وجہ سے درخت بھی سہمے سہمے کھڑے تھے۔ اتوار کا دن تھا۔ شاید زیادہ تر لوگ تفریح کی جگہوں پر جا چکے تھے، اس لیے چہل پہل بھی زیادہ نہ تھی، پھر بھی کچھ جوڑے مٹر گشت کر رہے تھے۔ ایک لڑکی کُتّے سے کھیل رہی تھی بلکہ ایک گیند سے دونوں کھیل رہے تھے۔

لڑکی گیند پھینکتی کتّا اس کے پیچھے دوڑتا، لیکن لڑکی خود دوڑ کر گیند اُٹھا لیتی۔ شاید یہ بھی ورزش کا ایک طریقہ ہو یا تنہائی کا احساس دُور کرنے کی تدبیر۔ اتنی ترقی کے باوجود انسان ابھی تک تنہا تنہا ہے۔

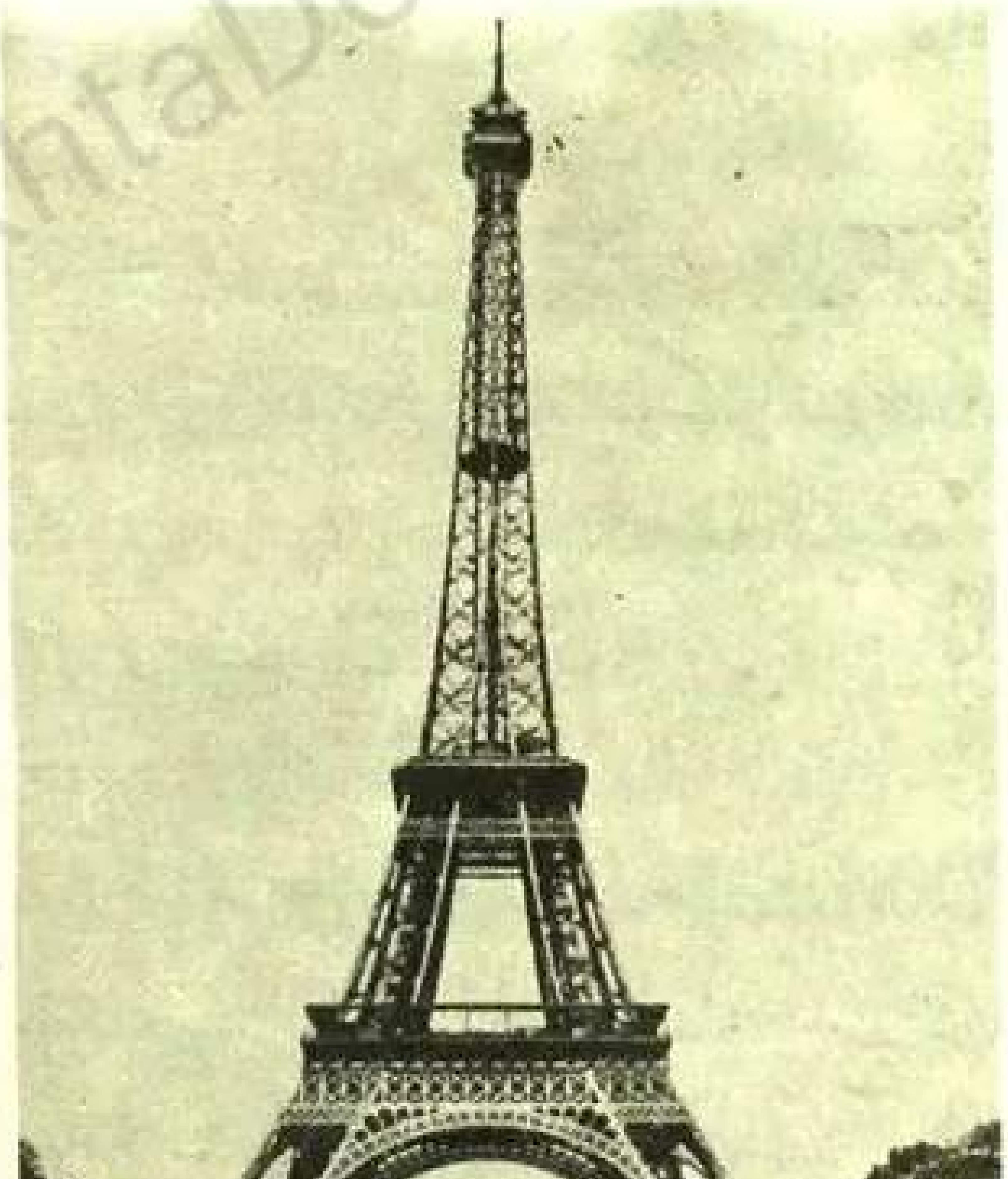

ویسے پیرس میں اور لندن میں بھی کتّوں کی بہار تھی۔ جس کو دیکھو کتّا لیے جا رہا ہے۔ ہر قسم، ہر سائز، ہر شکل کے کُتّے انسانوں کے ساتھ پھر رہے ہیں۔ کسی آدمی کو دیکھیے تو وہ مُنّا سا پلّا لیے پھر رہا ہے۔ کسی عورت کو دیکھیے تو ایک خونخوار کتّا اس کا ہمراہی ہے، جو اگر گدھے کے برابر نہیں تو بکرے کے برابر ضرور ہو گا۔ کسی دُکان میں گھسو تو لال بھبھوکا کتّا براجمان ہے۔ میں ایک کتابوں کی چھوٹی سی دُکان میں گیا تو سیلز گرل کے ساتھ ساتھ ایک کالی بدہیت کُتیا نے بھی استقبال کیا۔ لندن میں بھی یہی حال تھا۔ ایک

بارٹونگ بیک اسٹیشن کے پاس ایک ڈاک خانے میں ٹکٹ لینے گیا۔ قطار لگی ہوئی تھی۔ زیادہ آدمی نہیں تھے، لیکن قطار ان لوگوں کی عادت ہے، دو تین آدمی بھی ہوں گے تو قطار میں کھڑے ہوں گے۔ میں بھی قطار میں لگ گیا۔ اس کے بعد جو محترمہ آئیں تو ان کے ساتھ ایک ڈراؤنا (میرے لیے) کتّا بھی تھا۔ مجھے کتّوں سے بہت ہی گھن آتی ہے۔ جتنی دیر قطار میں رہا کوفت میں مبتلا رہا۔ پیرس میں میں نے یہ بھی دیکھا کہ کتّے صاحب نے وہی حرکت کی، جو یہاں عام دیکھنے میں آتی ہے کہ ایک کھڑی ہوئی کار کو نہلا دیا اور بے نیازی سے آگے بڑھ گئے۔ کتّا آخر کتّا ہے۔

ہوٹل ڈوکین سے ایک فولادی مینار نظر آیا۔ فوراً خیال آیا، اچھا یہی ہے وہ ایفل ٹاور جس کی زمانے میں دھوم ہے۔ کہتے ہیں پیرس کے حُسن میں دریائے سین کو بڑا دخل ہے۔ سین پر سارے فرانس والے جان دیتے ہیں۔ سین پیرس کے جنوب میں مشرقی سرے سے داخل ہوتا ہے اور شمال کی طرف گولائی میں گھوم کر جنوب مغربی سمت سے باہر نکل جاتا ہے۔ سین کے کنارے کئی تاریخی چیزیں دیکھنے کی ہیں۔ لوور میوزیم بھی اس کے کنارے ہی ہے۔ اس میوزیم سے سین کے پانی کے بہاؤ کے رُخ چل کر ایفل ٹاور آتا ہے۔ یہ ٹاور پیرس کے اکثر حصّوں سے ایسا ہی نظر آتا ہے جیسے چند قدم کے فاصلے پر ہو گا۔ میں نے ڈوکین کی سڑک پر کھڑے ہو کر سوچا کہ رات تو ہو گئی ہے لیکن جب یہ ٹاور اتنے قریب ہے تو کیوں نہ لپک کر دیکھ آؤں، لیکن دراصل ایفل وہاں سے بہت دُور تھا۔ ۹۸۵ فیٹ اونچا یہ ٹاور کوئی سو سال پہلے (۱۸۸۹ء میں) ایک انجنیئر الیگزنڈر گستاف ایفل نے ایک نمائش کے موقع پر بنایا تھا۔ تین سال تک اس انجنیئر نے محنت کر کے یہ عجیب و غریب مینار کھڑا کر دیا۔ بنانے سے پہلے بہت مخالفت بھی ہوئی کہ یہ فولاد کا اتنا اونچا مینار ٹکنے والا نہیں، لیکن دُھن کے پکّے ایفل نے بنا کر ہی دم لیا۔ لگن ہی بڑے کام کرواتی ہے۔ چناں چہ اسی مینار کی وجہ سے ایفل کا نام زندہ ہے۔ یہ یورپ کی بلند ترین عمارتوں میں سے ہے۔ اس کے اوپر ٹیلی وژن کے مستول کے اضافے سے اب اس کی بلندی ۱۰۵۱ فیٹ ہو گئی ہے۔ اس مینار کے پورے ڈھانچے کا وزن سات ہزار ٹن ہے۔ مختلف بلندیوں پر اس کے تین پلیٹ فارم بنے ہوئے ہیں۔ سب سے اُونچا پلیٹ فارم ۹۰۰ فیٹ کی بلندی پر ہے۔ پہلے پلیٹ فارم پر ایک ریسٹوران ہے۔ اس کی چوٹی پر تجربہ گاہیں اور موسمی اطلاعات فراہم کرنے کا دفتر ہے۔ اگر مطلع صاف ہو تو دن کے وقت ٹاور کے اوپر سے پچاس میل سے بھی زیادہ دُور تک کا نظارہ کیا جا سکتا ہے۔

۶

پیرس کی خوب صورتی، پیرس کی تہذیب شناسی، پیرس کی علم دوستی کی بنا پر ہی شاید یہاں یونیسکو کا صدر دفتر بنایا گیا ہے، اور واقعی تعلیم، سائنس اور ثقافت کے بین الاقوامی ادارے کو یہیں ہونا چاہیے تھا۔ اس فیصلے کی داد دینی پڑتی ہے۔ اس ادارے کی ایک خصوصیت یہ بھی ہے کہ اس کا پہلا ڈائرکٹر جنرل ایک مشہور مصنف اور سائنس داں تھا، جولیٹن ہکسلے۔ جولیٹن صاحب مشہور ماہر تعلیم اور ماہر حیاتیات ٹامس ہنری ہکسلے کے پوتے اور مشہور ناول نگار ایلڈس ہکسلے کے بھائی تھے۔ جولیٹن ہکسلے لندن میں ۱۸۸۷ء میں پیدا ہوئے تھے۔ ان کی سائنسی تحقیق زیادہ تر پرندوں کے بارے میں ہے۔ تحقیق کے علاوہ جولیٹن صاحب نے بہت سے سائنسی مضامین اور کتابیں بھی لکھیں۔ ۱۹۷۰ء میں ان کی خود نوشت سوانح عمری بھی شائع ہوئی تھی۔ انھوں نے سائنس کو عام زبان میں پیش کر کے اس کو مقبول بنایا۔ وہ ۱۹۴۶ء سے ۱۹۴۸ء تک یونیسکو کے پہلے ڈائرکٹر جنرل رہے۔ ۱۹۷۵ء میں اپنے وطن لندن ہی میں انتقال کیا۔

کم سے کم میرے ذہن میں یونیسکو اور پیرس اس طرح آپس میں مل گئے ہیں کہ اگر کسی وقت کسی وجہ سے یونیسکو کا صدر دفتر کسی اور شہر منتقل کر دیا جائے تو میں سمجھوں گا کہ یونیسکو میں کچھ کمی آ گئی ہے۔

پیرس میں، میں ایک دن یونیسکو کے قریب ایک بازار میں جا رہا تھا کہ ایک دُکان کے باہر کچھ چھوٹی بڑی پُرانی دُھرانی چیزیں نظر آئیں۔ خالی ڈبے، بوتلیں، بے جوڑ برتن، ایک آدھ بدرنگ کرسی اور پھر نظر کتابوں پر جم کر رہ گئی۔ پرانی کتابیں بھی اس کباڑ کی دُکان پر رکھی تھیں۔ نظروں کے ساتھ ساتھ قدم بھی رُک گئے۔ اہاہا، کتابیں!

شاید کچھ اچھی سی کتابیں مل جائیں، اور سیکنڈ ہینڈ ہونے کی وجہ سے سستی بھی ہوں گی، ورنہ آج کل کتابوں کی قیمتیں بھی آسمان تک نہیں تو بادلوں تک تو پہنچ ہی گئی ہیں۔ اپنے ملک میں بھی اور مغربی ملکوں میں تو ہر چیز ہی مہنگی ہے۔ لندن میں تو چند کتابیں خرید لی تھیں۔ دو کتابیں کہانیوں کی تھیں کہ شاید یہ ہمدرد نونہال کے لیے کار آمد ہوں۔ ایک بہت عمدہ کتاب کتابوں ہی کے متعلق (THE BOOK ABOUT BOOKS) خریدی۔ کہتے ہیں کہ جب انسان کو رفاقت کی ضرورت ہو تو کتاب اس کی بہترین دوست ہے، جب انسان کسی کش مکش اور شک شبے کی حالت میں ہو تو کتاب اس کی مشیر ہے، جب انسان کسی روحانی قسم کی بے چینی میں ہو تو کتاب اس کے لیے بہت عمدہ تسکین کا ذریعہ ہے، جب انسان اُکتاہٹ اور بیزاری میں مبتلا ہو تو کتاب اس کے لیے سب سے اچھی تفریح ہے۔ اس کتاب میں کتابوں کے عاشقوں کے لیے سب کچھ نہیں تو بہت کچھ تو ضرور ہونا ہے۔ اس کتاب کی قیمت ساڑھے اکتالیس پونڈ ہے، لیکن لندن میں جس دُکان سے میں نے یہ خریدی اس پر "سیل" ہو رہی تھی۔ اس لیے اس نے صرف تین پونڈ ۹۵ پنس میں دی۔ یعنی کوئی ۹۰۰ رُپے کی کتاب ۹۰ رُپے میں مل گئی۔ یہ ہوتی ہے "سیل"۔ ایک سیل ہمارے ہاں ہوتی ہے کہ بڑے بڑے اعلانات اور دعوے مگر حقیقت میں رعایت یا کمی کچھ نہیں یا برائے نام۔

یہ "کتابوں کے متعلق کتاب" میرے پسندیدہ موضوع پر ہے۔ ۲۰-۲۵ سال سے میں اس موضوع پر خود کتاب لکھنے کا ارادہ کر رہا ہوں، اور خاصی کتابیں بھی جمع کر لی ہیں۔ اردو میں تو اب تک کوئی ایسی کتاب لکھی ہی نہیں گئی۔ انگریزی میں خاصی کتابیں لکھی گئی ہیں۔ اصل میں کتاب کا مطالعہ بھی ایک فن ہے۔ اس فن کے آداب اور نکات جانے بغیر کتابیں پڑھنے والے بھی اس سے فائدہ نہیں اُٹھا سکتے۔ اس لیے مطالعے کے فن پر بھی کتابیں ہونی چاہییں۔ بہر حال پیرس میں اس کباڑ خانے میں کتابوں پر لپکا، مگر وہاں تو کوئی کتاب بھی انگریزی میں نہیں تھی۔ ساری کتابیں، رسالے صرف فرانسیسی میں تھے۔ امیدوں کے محل دھڑام سے زمین پر آ گئے۔

ایک جگہ اور بھی پیرس میں پرانی کتابیں رسالے ملتے ہیں۔ کتابیں کم، رسالے زیادہ۔ یہ جگہ ہے مشہور نوترے دیم چرچ کے قریب دریائے سین کے کنارے کنارے بہت دُور تک چھوٹے چھوٹے کیبن لگے ہیں اور وہ رسالوں یا تصویروں سے بھرے پڑے ہیں۔ رسالے بھی سب فرانسیسی زبان کے تھے، مگر مجھے اتنا اندازہ ہو گیا کہ یہ زیادہ تر تفریحی رسالے ہیں کسی سنجیدہ موضوع پر یا علمی رسالے نہیں ہیں، کیوں کہ

اکثر رسالے تصویروں سے بھرے پڑے تھے۔ جب "نوتر ے دیم" دیکھنے گیا تو ان کیبنوں میں خاصا وقت خرچ کیا، مگر کوئی کام کی چیز نہیں ملی۔ مصوروں کی بنائی ہوئی تصویریں بھی بہت تھیں، لیکن ان کو سمجھنے اور چُننے کے لیے بہت وقت اور پیسا چاہیے۔ دونوں چیزوں میں، میں غریب ہوں۔

پرانی چیزوں کی دُکان پر بھی اور ان کیبنوں پر بھی میں یہ سوچتا رہا کہ پرانی چیزوں کے شوقین لوگوں کی بھی یہاں کمی نہیں۔ ایسی دُکانوں پر بھی گاہکوں کی تعداد خاصی ہوتی ہے۔ یہ لوگ ویسے تو جدت کے عاشق ہیں۔ نئی نئی چیزیں ایجاد کرتے، بناتے اور رائج کرتے ہیں۔ جلدی جلدی فیشن بدلتے ہیں۔ زندگی کے ہر میدان میں نئی سے نئی بات سوچتے ہیں، لیکن اسی کے ساتھ پرانی اور قدیم چیزوں سے لگاؤ بھی ہے۔ پرانی چیزوں کو محفوظ کرنے میں بھی ان کا جواب نہیں۔ لندن ہو کہ پیرس ان کے عجائب گھر اس کی گواہی دیں گے۔ قسم قسم کے عجائب گھر اور ہر عجائب گھر اپنی جگہ خود تاریخ۔

لندن کا برٹش میوزیم ہو یا پیرس کا لوور میوزیم، پرانی چیزوں کو محفوظ کرنے کے جذبے کی منھ بولتی تصویر ہیں۔ کیا چیز وہاں نہیں ہے اور پھر کس سلیقے سے رکھی ہے۔ جان سے زیادہ اس کی حفاظت کرتے ہیں۔ اُن کی اپنی ہی نہیں ہماری چیزیں بھی وہاں ملیں گی۔ وہ اپنے ماضی اور مستقبل دونوں کو اہم سمجھتے ہیں، اسی لیے اُن کا حال اچھا ہے۔

پرانی چیزوں کی قدر پر یاد آیا۔ کیمبرج میں روزنامہ اسٹیٹسمین کے سابق ایڈیٹر جناب اسٹیفن رہتے ہیں۔ ان کے زمانے میں اس اخبار کی انگریزی بہت عمدہ تھی۔ اس وقت اسٹیفن صاحب نوّے سے اوپر ہوں گے، جناب حکیم محمد سعید سے ان کی دوستی ہے، خط و کتابت بھی رہتی ہے۔ اس سفر میں اسٹیفن صاحب سے ملنے کیمبرج گئے۔ ایک چھوٹے سے مکان میں رہتے ہیں۔ بہت ضعیف ہو گئے ہیں۔ حکیم صاحب کے ساتھ میرے علاوہ جناب یوسف حسین نقوی اور ان کے صاحب زادے اطہر حسین نقوی بھی تھے۔ ہم پہنچے تو اسٹیفن صاحب منتظر ہی تھے۔ بہت خوش ہوئے۔ ان کی بیٹھک (ڈرائنگ روم) میں بھی کتابوں رسالوں کا غلبہ تھا۔ چھوٹی چھوٹی چار پانچ قالینیں قریب قریب بچھی ہوئی تھیں۔ کرسیاں اس طرح رکھی تھیں کہ قالینوں پر نہ آئیں۔ ہم میں سے کسی صاحب نے بیٹھتے بیٹھتے کرسی کو کھسکایا تو کرسی ایک قالین پر چڑھ گئی۔ اسٹیفن صاحب نے فوراً ٹوکا بلکہ روکا۔ کہنے لگے کہ یہ قالینیں میں ہندستان سے ساتھ لایا ہوں، اور یہ میرے لیے کسی نے افغانستان سے ہندستان بھیجی تھیں۔ میں نے اب تک ان کو بہت سنبھال کر رکھا ہے اور وصیت کر دی ہے کہ میرے بعد ان کو کیمبرج یونی ورسٹی کو دے دیا جائے۔

اسٹیفن صاحب کے ایک کمرے میں ایک گروپ فوٹو بھی لگا ہوا تھا۔ انھوں نے بتایا کہ یہ ہندستان میں میرے ملازمین کے ساتھ میری تصویر ہے جو یہاں آتے وقت کھنچوائی تھی۔ اس میں ان کا باورچی، چپراسی اور شوفر شامل تھے۔ ان میں کسی کا نام اسٹیفن صاحب نے صدیق بتایا اور کہا کہ ہم اس کو مذاق میں "چمچہ" کہا کرتے تھے۔ وہاں اسٹیفن صاحب کے ساتھ ہم نے بھی حکیم صاحب کے کیمرے سے ایک تصویر اُتاری تھی، مگر افسوس کہ تصویر بہت دُھندلی آئی۔

چلتے وقت اسٹیفن صاحب گھر کے باہر آئے اور راستہ بھی بتایا کہ میرے گھر کے بعد جو گلی آئے اس میں اُلٹے ہاتھ کو مُڑ جائیں تو میرے گھر کے پیچھے سے ہوتے ہوئے سیدھے اس سڑک پر آجائیں گے جو یونی ورسٹی کو جاتی ہے۔ ہم اُن کی رہنمائی کے مطابق جب گھوم کر اُس سڑک پر پہنچے تو کنارے پر اسٹیفن صاحب کھڑے تھے۔ وہ یہ اطمینان کرنے کہ ہم راستہ بھٹک تو نہیں گئے ہیں اور خدا حافظ کہنے اپنی پیری اور کم زوری کے باوجود اتنی دُور تک آئے تھے۔ اس اخلاق نے حکیم صاحب کو اور ہم سب کو بہت متاثر کیا۔

اس کے بعد ہمیں جناب ڈاکٹر معزالدین صاحب کے ہاں جانا تھا، جو لاہور میں اقبال اکیڈمی کے ناظم تھے اور اب کیمبرج یونی ورسٹی میں اقبال چیئر پر مقرر کیے گئے تھے۔ وہ دوپہر کے کھانے پر منتظر تھے۔ کھانا بہت مزے دار تھا۔ ان کی بچّی ہمدرد نونہال کی بہت شوقین ہے۔ جب سے ڈاکٹر معزالدین صاحب کیمبرج پہنچے ہیں اس بچّی کو ہمدرد نونہال پڑھنے کو نہیں ملا تھا۔ ہم نے وعدہ کیا کہ کراچی واپس پہنچ کر رسالہ تمھیں بھجوائیں گے۔ ڈاکٹر صاحب کی بیگم نے حکیم صاحب سے طبّی مشورہ بھی کیا۔ کھانے کے بعد ڈاکٹر صاحب ہمیں کیمبرج یونی ورسٹی کی لائبریری لے گئے۔ اس لائبریری میں بہت سے شعبے ہیں۔ ایک شعبہ ہندستان کا بھی ہے، لیکن پاکستان پر کتابیں نہیں ہیں۔ اس سے بڑا صدمہ ہوا۔ حکیم صاحب نے کہا کہ اگر یونی ورسٹی چاہے تو میں اس سلسلے میں تعاون کر سکتا ہوں، لیکن پاکستان پر یہاں کتابیں ضرور ہونی چاہییں۔

پاکستان سے باہر جا کر ہمیں اپنی خامیوں کا زیادہ اندازہ ہوا کہ ہم پاکستان سے اپنی محبّت کا دَم بھرتے ہیں، لیکن پاکستان کی خدمت اور نیک نامی کے لیے ٹھوس کوششیں نہیں کرتے۔ معلوم نہیں ہمارے سفارت خانے والے بھی یہ باتیں سوچتے ہیں کہ نہیں۔ پاکستان ہی سے ہمارا وجود ہے۔ جو کام بھی ہم پاکستان کے لیے کریں گے وہ گویا اپنے لیے ہی کریں گے۔

۷

پاکستان سے محبت کے اظہار کا ایک طریقہ یہ بھی ہے کہ ہم دوسرے ملکوں میں جو چیزیں برآمد کریں وہ اتنی اچھی ہوں کہ وہاں کے لوگ پاکستان اور پاکستانیوں کو بھی اچھا سمجھنے لگیں۔ اس طرح خود تجارت کرنے والوں کو تو فائدہ ہو گا ہی، ہمارے پیارے ملک کو بھی فائدہ ہو گا کہ دوسرے ملکوں سے زیادہ سے زیادہ پیسہ ہمارے ملک میں آئے گا۔ اس کے علاوہ پاکستان کا نام بھی روشن ہو گا اور پاکستانی ایک ذہین، محنتی اور ایمان دار قوم کی حیثیت سے شہرت پائیں گے۔ میں جب کوئی چیز خریدنا چاہتا ہوں اور بازار میں وہ چیز کئی ملکوں کی بنی ہوئی ملتی ہو تو میں چین یا جاپان کی بنی ہوئی چیز کو ترجیح دیتا ہوں، کیوں کہ میں نے ان ملکوں کی کوئی خراب چیز آج تک نہیں دیکھی، پھر ان کی چیزیں مہنگی بھی نہیں ہوتیں۔ اس لیے چین یا جاپان کی چیزیں آنکھ بند کر کے خرید لیتا ہوں۔ ہاں یہ اطمینان ضرور کر لینا پڑتا ہے کہ یہ چیز واقعی چین یا جاپان کی بنی ہوئی ہے اور اس پر کسی نے غلط تو نہیں لکھ دیا ہے، کیوں کہ بعض دفعہ یہ تجربہ بھی ہوا کہ کسی چیز پر "جاپان کی بنی ہوئی" کے بجائے "جاپان جیسی بنی ہوئی" (MADE AS JAPAN) لکھا ہوا ہے۔

ایسا کرنے والے یہ نہیں سوچتے کہ ہم نے جو چیز بنائی ہے وہ اگر اچھی ہے تو ہم اپنا اور اپنے ملک کا نام ہی کیوں نہ لکھیں اور کیوں نہ چمکائیں، لیکن اگر وہ چیز خراب ہے، معیاری نہیں ہے تو یہ دھوکا ہوا اور دھوکے کا سودا آخر میں نقصان پہنچاتا ہے۔ چین نے اسٹیشنری بنانے پر خاص توجہ دی ہے اور بہترین اسٹیشنری بناتی ہے، پھر سستی بھی بہت ہے۔ چین کے بنائے ہوئے فونٹین پن بڑے اچھے ہوتے ہیں۔ خوب لکھتے ہیں اور بہت دن چلتے ہیں۔ مجھے تو خیال ہوتا ہے کہ چین نے اتنا اچھا، اتنا خوب صورت، اتنا سستا اسٹیشنری کا سامان بنا کر پڑھے لکھوں کا دل جیتنے کا سامان کیا ہے، خاص طور پر بچوں اور طالبِ علموں کا۔ تعلیم یافتہ لوگوں کے ذہن کو فتح کرنے کا اس سے بہتر کیا طریقہ ہو سکتا ہے۔

چین اور جاپان کا مال میں نے لندن اور پیرس میں بھی دیکھا۔ لندن کی کئی دُکانوں میں چین کی

بہت سی چھوٹی بڑی چیزیں بکتی ہیں۔ اور جاپانی چیزوں کی تو ایک پوری دُکان ہی ہے۔ شاید اوکسفرڈ اسٹریٹ میں ہے۔ بہت بڑی دُکان ہے۔ چھوٹی چیزیں، پیاری پیاری چیزیں، سجانے کے کام کی چیزیں دُکان میں بھری پڑی ہیں۔ دِل چاہے کہ پوری دُکان خرید لو۔ اس دُکان کی سیلز گرلز بھی جاپانی معلوم ہوتی ہیں، کیوں کہ دُکان دار نے چُن چُن کر چھوٹے چھوٹے قد کی لڑکیاں رکھی ہیں۔ دُکان میں داخل ہوتے ہی بڑے تپاک سے مُسکرا کر اور بڑی شوخی سے وہ گاہک کا استقبال کرتی ہیں اور بڑے اطمینان سے گاہک کو چیزیں دِکھاتی ہیں۔ قیمتیں تو وہاں ہر چیز پر لکھی ہی ہوتی ہیں، لیکن وہ ہر سوال کا جواب بڑی خندہ پیشانی سے دیتی ہیں اور گاہک کو خریداری پر مجبور کر دیتی ہیں۔ میں تو پہلے یہی سمجھا کہ یہ جاپانی لڑکیاں ہیں، لیکن ان کی اچھی انگریزی سُن کر مجھے خیال بدلنا پڑا اور ایک لڑکی نے کہا کہ میں نے تو جاپان دیکھا بھی نہیں، کیا تم مجھے لے چلو گے۔ افسوس کہ پاکستان کا مال مجھے وہاں نظر نہیں آیا، نہ لندن میں نہ پیرس میں۔ ہاں کھانے پینے کی بعض دُکانیں ضرور نظر آئیں۔ میں سوچتا رہا کہ ہم میں کیا کمی ہے؟ کیا ہم معذور ہیں؟ کیا ہم لنگڑے لُولے ہیں؟ کیا ہم میں عقل نہیں ہے؟ ہاں شاید عقل ہی نہیں ہے۔ یہ بے عقلی کی ہی تو بات ہے کہ ہم بیرونی ملکوں کو مال کا نمونہ اچھا بھیجتے ہیں، لیکن جب وہ مال منگواتے ہیں تو ہم مال ناقص اور کم زور بھیجتے ہیں۔ نتیجہ ظاہر ہے کہ وہ دوبارہ مال نہیں منگواتے۔ نقصان میں کون رہا؟ ہم، ہمارا ملک۔ کیا یہ عقل مندی کی بات ہے۔

پیرس سے واپسی میں زیورخ سے جہاز بدلنا تھا۔ وہاں دو گھنٹے رُکا۔ ہوائی اڈّے سے باہر تو جانے نہیں دیا۔ سوئس ایئر جس کے جہاز میں، میں سفر کر رہا تھا، اس کے کاؤنٹر پر جو لڑکی بیٹھی تھی اس نے تو کہا بھی کہ آپ تھوڑی دیر کے لیے باہر جا کر شہر دیکھ سکتے ہیں، لیکن میں نے کہا کہ کھڑکی پر جو آفیسر ہے اس نے تو مجھے اجازت نہیں دی اور کہا کہ وقت کم ہے۔ تم مدد کر دو، تو لڑکی نے کہا کہ وہ پولیس آفیسر ہے اُس کا موڈ نہیں ہے تو اجازت ملنی مشکل ہے۔ گویا ان ملکوں میں بھی لوگ پولیس والوں سے مانوس نہیں ہوتے۔ خیر دو گھنٹے میں نے ہوائی اڈّے پر ہی گھوم پھر کر گزارے۔ یورپی ملکوں کے ہوائی اڈّے کیا ہوتے ہیں ایک میلا ہوتا ہے۔ دو کیا دس گھنٹے بھی گزر جائیں۔

میں نے دُکانوں پر نظر ڈالی۔ ایک خاصا بڑا ہال نظر آیا۔ اس میں لوگ قطار باندھ کر داخل ہو رہے تھے۔ مجھے بھی اشتیاق ہوا اور میں اس میں گھس گیا، مگر وہاں تو زیادہ تر شراب اور سگرٹ تھی۔ الٰہی توبہ۔ یہ لوگ شراب کے پیچھے اتنے دیوانے کیوں ہیں۔ ہوائی اڈّوں پر شراب سستی ملتی ہے۔

اس لیے ٹوٹے پڑ رہے ہیں اور ہوائی جہاز میں تو مفت کی پلاتے ہیں۔ مرزا غالب کو قرض کی پینا پڑتی تھی، وہ اگر آج ہوتے اور کوئی اُن کو پیرس پہنچا دیتا تو اُن کو فاقہ مستی کی شکایت نہیں ہوتی۔ ان کی شاعری کی قدر بھی ہوتی اور ان کی پینے کی بُری عادت بھی پوری ہو جاتی۔ پیرس والے فن اور فن کار کے بڑے قدر داں ہیں۔ سر آنکھوں پر بٹھاتے ہیں اور زر نچھاور کرتے ہیں۔ غالب بھی کس مُردہ قوم میں پیدا ہوئے۔ مُردہ قومیں مُردہ پرست بھی ہوتی ہیں۔ مرنے کے بعد غالب کی پوجا شروع کر دی۔ اب تو غالب خوب بِک رہے ہیں اور لوگوں کی دُکانیں خوب چمک رہی ہیں، لیکن غالب کو اپنی بڑائی کا اندازہ تھا۔ انھوں نے یہ کہہ بھی دیا تھا کہ میرے مرنے کے بعد دنیا میں میرا نام چمکے گا۔ سو واقعی چمک رہا ہے۔

خیر غالب کو تو چھوڑیے، اس وقت تو ساری دنیا ہی شراب خوری سے مغلوب ہو رہی ہے۔ پیرس میں تو میرا اندازہ ہے کہ لوگ چائے کوفی کم پیتے ہیں شراب زیادہ پیتے ہیں۔ ایک اور دل چسپ بات یہ ہے کہ وہاں چائے مہنگی ہے، کوفی سستی ہے، اور چائے کا ذوق بھی نہیں ہے۔ بے جان چائے پیتے ہیں۔ جب مجھ پر انکشاف ہوا کہ کوفی سستی ہے اور چائے "تنگڑی" بھی تو پھر میں نے ریستورانوں میں کوفی ہی منگوانی شروع کی۔ چائے آٹھ فرانسیسی فرانک میں اور کوفی پانچ فرانک کی۔ اِدھر بیرے نے چائے یا کوفی کی ٹرے لا کر رکھی، اُدھر بل بھی لے آیا۔ وہ یہ انتظار نہیں کرتا کہ آپ چائے پی لیں اور پھر چلنے کا ارادہ کر لیں تو بِل طلب کریں۔ یہی نہیں بل لا کر فوراً ہی پیسے بھی طلب کر لیتا ہے۔

ایک بڑے مزے کی بات ہوئی۔ ہوٹل ڈوکین کے کمرے میں "منی بار" بھی تھی۔ عام طور پر اچھی ہوٹلوں میں (پاکستان میں بھی) ہوٹل کے کمروں میں ایک الماری میں یا میز میں ایک "منی بار" ہوتی ہے، یعنی فوری ضرورت کے لائق اس میں کوک وغیرہ مشروبات رکھے ہوتے ہیں۔ آپ چاہیں تو اس میں سے ضرورت کے مطابق بوتلیں نکال کر پی لیں اور کارڈ پر اندراج کر دیں۔ پیرس میں ہر بوتل کے ۹ فرانک ہوتے تھے۔ خیر میں نے بھی اس میں چند بار بوتلیں پییں، مگر ایک بار جو بوتل پی تو بہت کڑوی، میں نے تھوڑی سی پی کر چھوڑ دی۔ شام کو حکیم صاحب سے ذکر کیا تو حکیم صاحب نے فرمایا کہ آج تو آپ نے "پی" لی، اور پھر خوب ہنسے، مجھے بھی غیر معمولی کڑواہٹ سے شبہ تو تھا ہی، حکیم صاحب کے کہنے سے کچھ یقین سا ہو گیا کہ واقعی آج تو دھوکے میں پی گیا، لیکن حکیم صاحب

نے تھوڑی دیر میری کیفیت کا لطف لینے کے بعد بتایا کہ نہیں کولا کی ایک قسم یہاں ایسی ہے جس کا مزہ بہت تلخ ہے۔ اس کا نام "پیرے" یا کچھ اسی قسم کا ہے، میں نے کہا کہ جی ہاں بوتل پر لکھا تو یہی تھا۔ بہر حال کچھ بھی ہو وہ تلخ گھونٹ حلق سے اُتر چکا تھا۔ زندگی میں نہ جانے کتنے کڑوے گھونٹ پینے پڑتے ہیں۔

ہاں تو میں زیورخ کے ہوائی اڈّے پر ہوں۔ اس دُکان سے نکلا تو ایک اور دُکان نظر آئی۔ اس میں طرح طرح کی چیزیں تھیں۔ ان میں لکڑی کی بنی ہوئی پلیٹیں اور برتن اور کھرل وغیرہ تھی۔ صاف ستھری لکڑی کی خوب صورت ترشی ہوئی چیزیں بنی ہوئی تھیں۔ سوچا ایک آدھ چیز خریدوں قیمت پوچھی تو پیروں کے نیچے سے زمین نکل گئی اور کراچی تک پیر زمین پر نہیں ٹکے۔ کوئی چیز سو رُپے سے کم نہیں تھی۔ خیال آیا کہ ہم یہ چیزیں بنا کر ان ملکوں کو برآمد کر سکتے ہیں۔ پاکستان میں ماہر کاری گروں کی کمی نہیں۔ اسی طرح سوچا جائے تو اور بہت سی چیزیں پاکستان سے برآمد کی جاسکتی ہیں، مگر ہم درآمد زیادہ کرتے ہیں۔ پاکستان میں آپ کو دنیا کے شاید ہر ملک کا مال مل جائے گا۔ باقاعدہ بھی آتا ہے اور بے قاعدہ بھی آتا ہوگا۔ دوسرے ملکوں کی چیزیں ہوتی بھی اچھی ہیں، لیکن اس کے ساتھ یہ بات بھی ہے کہ اپنے ملک کی چیزوں پر سے خود ہمارا اعتماد بھی اُٹھ گیا ہے۔ پاکستانی صنعت کار معیار قائم نہیں رکھتے ورنہ ہم میں ہر چیز بنانے کی صلاحیت ہے۔ کپڑا ہمارے ہاں کتنا عمدہ بنتا ہے۔ کیا کہنے پاکستانی کپڑے کے۔ خوب صورت بھی اور مضبوط بھی۔ اور اتنا مہنگا بھی نہیں ہے۔ ہندُستان کپڑے میں ہمارا مقابلہ نہیں کر سکا۔ وہاں کا کپڑا ڈیزائن میں بھی اتنا اچھا نہیں ہوتا اور پھر مہنگا بھی ہے، لیکن ہندُستان کی پالیسی اس معاملے میں عقل مندانہ رہی ہے۔ اس نے شروع ہی سے بیرونی چیزوں کی درآمد بند کر رکھی ہے۔ اس کا فائدہ یہ ہوا کہ آہستہ آہستہ سب چیزیں ملک ہی میں بننے لگیں۔ آج ہندُستان میں سوئی سے لے کر ہوائی جہاز تک بنتا ہے اور وہ نہ معلوم کتنی چیزیں بڑے بڑے ملکوں کو بھی برآمد کرتا ہے اور خوب زرِمبادلہ کماتا ہے۔ آفسٹ پرنٹنگ کی مشینیں روس کو برآمد کی جاتی ہیں۔ ظاہر ہے کہ یہ مشینیں گھٹیا نہیں ہوتی ہوں گی۔ پیرس میں، میں نے ہندُستان کا بنا ہوا چمڑے کا سامان دیکھا۔ ہُوا یہ کہ حکیم صاحب کو پیرس سے امریکا اور کینیڈا جانا تھا اور مجھے واپس کراچی آنا تھا۔ حکیم صاحب سفر میں بھی اُسی طرح کام کرتے ہیں جس طرح گھر میں۔ چناں چہ وہ لندن اور پیرس میں بھی دوسرے کاموں کے علاوہ اپنی کتاب کو رِیا کہانی لکھتے رہے۔

۸

"کوریا کہانی" حکیم صاحب کا شمالی کوریا کا سفرنامہ ہے۔ پیرس میں انھوں نے اس سفرنامے کی نوک پلک درست کر کے مسودہ میرے حوالے کیا۔ اس کے علاوہ کچھ اور کاغذات بھی مجھے دیے کہ اپنے ساتھ کراچی لے جائیے۔ کچھ میرا سامان بھی بڑھ گیا تھا، چناں چہ میں ایک چھوٹے سوٹ کیس کی تلاش میں بازار نکلا۔ ڈھونڈتے ڈھونڈتے ایک دُکان پر کچھ مناسب سائز کے سوٹ کیس نظر آئے۔ دُکان دارنی نے بڑے فخر سے کہا" انڈیا کے ہیں انڈیا کے" گویا انڈیا کی چیز بہت عمدہ ہوتی ہے اور ہندُستان کی بنی ہوئی چیزوں کی شہرت اچھی ہے۔ دام پوچھے تو کوئی سوٹ کیس بارہ سو رُپے سے کم کا نہ تھا۔ دُکان دارنی اوپر سے سوٹ کیس اُتارنے لگی تو کچھ اخلاقاً اور کچھ اپنی قدآوری جتانے کے لیے میں نے خود ہی سوٹ کیس

جناب حکیم محمد سعید جناب یوسف حسین نقوی کی پوتی زہرا کے ساتھ لندن میں

پکڑ کر کھینچا تو وہ پھسل کر میرے سر پر آ گرا مزہ ہی تو آ گیا۔ بے چاری افسوس اور ہمدردی کرنے لگی۔ خیر کھوپڑی سہلا کر رہ گیا۔ ہندستانی سوٹ کیس کے علاوہ گھوڑے کی زینیں وغیرہ بھی بہت رکھی ہوئی تھیں۔ بہرحال میں نے تو فرانس ہی کا بنا ہوا ایک ہلکا سا درمیانی سوٹ کیس خریدا اور پھر دُکان دار نی سے فوٹو گرافی کی دُکان کا پتا پوچھا، جو اس نے بڑی توجہ اور وضاحت سے بتایا۔

مجھے تو اصل میں فلم کی رِیل لینی تھی۔ کیمرا تو میں لندن سے خرید چکا تھا اور لندن اور پیرس میں کئی تصویریں کھینچ چکا تھا۔ کراچی پہنچ کر جب رِیل دُھلوائی تو معلوم ہوا کہ آدھی کے قریب تصویریں خراب ہو گئیں، یعنی رِیل کو واپس لپیٹنے (ری وائنڈ) میں کوتاہی ہوئی اور آدھی رِیل پر روشنی پڑ گئی۔ عجیب بات ہے! کیا روشنی نقصان بھی پہنچاتی ہے؟ ہاں بے موقع تو کوئی چیز بھی ہو مضر ہی ہو گی۔

اس کیمرے سے سب سے پہلے تو لندن میں حکیم صاحب کی تصویر کھینچی۔ جناب یوسف حسین نقوی کی پوتی زہرا بنت اطہر حسین نقوی حکیم صاحب کے پاس بیٹھی ہے۔ پیرس میں کئی تصویریں مختلف مقامات کی اُتاریں۔ کہیں ایسا ہوتا کہ دل چاہتا کہ خود بھی اس منظر کا حصّہ بن جاؤں تو میں کسی بھی راستہ چلتے کو روک کر کیمرا اتھما دیتا اور درخواست کرتا کہ وہ زحمت کر کے بٹن دبا دے۔ کسی نے انکار تو کیا تامل بھی نہیں کیا اور نہ کیمرا لے کر بھاگا۔ مغربی ملکوں کے لوگوں کے اخلاق پر اتنا بھروسا تو آپ کر سکتے ہیں۔ اپنی تصویر اُتروانے کے بعد میں اخلاقاً ان سے کہتا تھا کہ آپ کھڑے ہو جائیں یا کھڑی ہو جائیں، میں آپ کی تصویر اُتار دوں۔ کوئی تیار ہو جاتا، اور کوئی شکریہ ادا کر کے انکار کر دیتا۔ نوترے دیم میں ایک خاتون نے میری تصویر اُتاری تو اپنی اُتروا بھی لی۔ معلوم نہیں اتفاق ہے یا اُس کا اناڑی پن یا میری مہارت کہ اس خاتون کی تصویر اچھی آئی ہے اور میری تصویر اتنی صاف نہیں آئی۔

پیرس میں محترم ڈاکٹر حمید اللہ صاحب دو بار ملنے ہوٹل تشریف لائے۔ ایک بار وہ اور محترم حکیم صاحب باتوں میں محو تھے۔ حکیم صاحب کا پسندیدہ موضوع تعلیم شروع ہو چکا تھا۔ مجھے خیال آ گیا۔ میں دوڑا دوڑا اپنے کمرے میں پہنچا اور کیمرا لے آیا۔ بڑا اچھا منظر تھا۔ میں کیمرے کا بٹن دبانے ہی والا تھا کہ ڈاکٹر صاحب نے دیکھ لیا اور منع کرتے ہوئے اپنا ہاتھ اپنے چہرے کے سامنے کر لیا۔ حکیم صاحب نے مسکراتے ہوئے کہا کہ یہ غیر شرعی حرکت ہے، لیکن میں نے تصویر کھینچ ہی لی۔ ڈاکٹر صاحب کا چہرہ آدھا چھپ گیا ہے، لیکن پھر بھی کیمرے کی آنکھ نے ان دونوں بزرگوں کو ایک جگہ محفوظ کر لیا ہے۔ ڈاکٹر صاحب بڑے عالم فاضل، نیک اور شریف انسان ہیں۔

عرصے سے پیرس میں رہتے ہیں اور خاموشی کی زندگی بسر کرتے ہیں۔ کتابیں لکھتے ہیں۔ پاکستان بننے کے بعد حکومت کے بُلانے پر کچھ دن کے لیے کراچی آئے تھے، مگر ان سے کوئی کام نہیں لیا گیا تو اُن کو شکایت یہ ہوئی کہ مجھ سے جب کوئی کام نہیں لیا جارہا تو میں کیوں وقت ضائع کروں اور مفت کی تنخواہ لوں۔ ڈاکٹر صاحب پیرس چلے گئے۔ وہاں نہایت سادہ اور خالص علمی زندگی گزار رہے ہیں۔ میں نے پوچھا کہ ڈاکٹر صاحب آپ یہاں سے کتنی دُور رہتے ہیں، فرمانے لگے کہ میٹرو (زمین دوز ریل) سے تو چند منٹ کا راستہ ہے، بیدل آدھے گھنٹے کا۔ میرا دِل چاہا کہ کہوں ڈاکٹر صاحب میں آپ کا گھر دیکھنا چاہتا ہوں۔ مجھے ساتھ لے چلیے، مگر پھر میں نے سوچا کہ نہ معلوم ان کے کن مشاغل میں خلل ہو، اور اپنے دِل کو مار لیا۔ مجھے یقین ہے کہ ڈاکٹر صاحب پیرس میں بھی جہاں تک ہو سکتا ہوگا بیدل ہی آتے جاتے ہوں گے۔ پاکستان میں بھی انھیں سواری استعمال کرتے کم ہی دیکھا تھا۔ ڈاکٹر صاحب نے کئی بہت اعلا تحقیقی کتابیں لکھی ہیں۔ فرانسیسی میں قرآن حکیم کا ترجمہ بھی کر رہے ہیں۔ ڈاکٹر صاحب مجھے یوں بھی پسند ہیں کہ وہ جو بات سچ سمجھتے ہیں اس پر عمل بھی کرتے ہیں۔ یعنی ان کے خیالات اور کردار میں یکسانیت ہے۔ بعض "بزرگوں" کے متعلق کہا جاتا ہے

جناب حکیم محمد سعید اور جناب ڈاکٹر حمید اللہ پیرس کے ہوٹل ڈ دکین میں

کہ وہ چاہتے ہیں کہ اُن کی تصویر کھینچی جائے۔ لیکن اگر اُن سے پوچھ لیجیے تو وہ منع کر دیں گے۔ گویا دل میں کچھ زبان پر کچھ۔ ڈاکٹر حمید اللہ صاحب ایسے بزرگوں میں نہیں ہیں۔ وہ تصویر کھنچوانا اچھا نہیں سمجھتے۔ اس لیے انھوں نے اپنے چہرے کے آگے ہاتھ پھیلا لیا، مگر اخلاقاً تصویر کھینچنے والے کو بُرا بھلا نہیں کہا۔
بہرحال مجھے تو خوشی ہے کہ ایک تاریخی تصویر مجھے حاصل ہو گئی، کیمرا کام آیا۔ لندن میں جس دُکان سے میں نے کیمرا خریدا تھا وہ بہت بڑی اور مشہور دُکان ہے، لیکن سیلز مینوں کا رویہ کچھ زیادہ پُر تپاک نہیں تھا۔ انھوں نے کیمرے کی خوبیاں بھی بیان نہیں کیں۔ میں نے دو چار مشہور نام لیے، اُن میں جو جو کیمرے اُن کے ہاں تھے وہ انھوں نے دِکھا دیے۔ مجھے کیمرا خریدنا ہی تھا، اور یہ معلوم تھا کہ "اولمپس" اچھا ہوتا ہے۔ اس لیے میں نے یہ کیمرا خرید لیا۔ اس میں ان کی "سیلز مینی" کا کوئی دخل نہیں ہے۔

اس سے پہلے لندن ہی میں ایک دُکان کے شوکیس میں کیمرے رکھے دیکھ کر میں دُکان میں داخل ہو گیا۔ اور اُن سے کیمرے دِکھانے کو کہا، مگر دُکان دار نے بتایا کہ ہم تو صرف پرانے کیمرے خریدتے اور بیچتے ہیں۔ یہ بتاتے وقت اس کا رویہ اور لہجہ دونوں نہایت پسندیدہ تھے۔ وہ بڑا کام یاب سیلز مین تھا، جو گاہک کی ضرورت کی چیز تو نہیں دے سکا، لیکن اس نے گاہک کا دِل ضرور جیت لیا، لیکن اسی لندن میں ایک سوٹ کیس کی دکان والے کا رویہ بھی خراب تھا۔ جب میں نے کئی سوٹ کیس دیکھے، مگر مجھے اُن میں سے کوئی بھی پسند نہ آیا تو دُکان دار کا رویہ ایک دَم بدل گیا اور اُس نے اپنا رُخ موڑ لیا۔ اندازہ ہوا کہ سب انگریز بھی اچھے تاجر نہیں ہیں۔ وہ تجارت سے زیادہ سیاست کے ماہر معلوم ہوتے ہیں۔

حکیم صاحب نے لندن میں ایک دل چسپ بات بتائی کہ یہاں جیلوں میں جگہ کی کمی ہے اس لیے عدالتوں کو اشارہ دیا گیا ہے کہ ہلکے جرموں پر کم مدت کی سزائیں یا صرف جرمانہ کر کے چھوڑ دو تاکہ جیلیں جلدی جلدی خالی ہوتی رہیں اور نئے مجرموں کو رکھنے کے لیے جگہ کا مسئلہ نہ پیدا ہو۔ اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ وہاں جرائم بڑھ رہے ہیں اور مجرموں کی تعداد بہت ہے۔

انگلستان میں ایک اچھا طریقہ یہ اختیار کیا گیا ہے کہ ہر محکمے یا ادارے پر یہ پابندی لگائی گئی ہے کہ وہ کچھ فی صد معذوروں کو بھی اپنے کارکنوں میں شامل کرے۔ اس لیے ایک تو معذور بھی بے کار نہیں رہتے۔ ایک طرف تو وہ اپنی روزی خود پیدا کر لیتے ہیں۔ دوسری طرف ان کی محنت او[illegible]یت ملک و قوم کے بھی کام آتی ہے۔ کیا ہم یہ طریقہ اپنے ہاں رائج نہیں کر سکتے۔ مجھے تو اس میں کوئی رکاوٹ نظر نہیں آتی سوائے دردِ دل اور دردِ قوم کی کمی کے۔

۹

جو لوگ عمر کی وجہ سے رِٹائر کر دیے جاتے ہیں، اُن میں سے اکثر اپنی صحت کے لحاظ سے کام کرنے کے قابل ہوتے ہیں۔ وہ اگر ضرورت مند بھی ہوں تو پیٹ پالنے کے لیے ان کو کچھ نہ کچھ کام کرنا پڑتا ہے، لیکن ان میں ایسے لوگ بھی ہوتے ہیں جن کو پیسے کی ضرورت نہیں رہتی، لہٰذا ان کا وقت بے کار ضائع ہوتا ہے اور اس کا ان کی صحت پر بھی خراب اثر پڑتا ہے۔ انگلستان میں ایسے لوگ حکومت کو اپنا نام لکھوا دیتے ہیں اور یہ بھی بتا دیتے ہیں کہ وہ روزانہ یا ہفتے میں اتنے دن اتنے گھنٹے بلامعاوضہ خدمتِ خلق کرنے کو تیار ہیں۔ چناں چہ حکومت اُن سے رفاہی کام لیتی ہے۔ اس طرح اُن کا وقت بھی اچھی طرح گزر جاتا ہے اور بھلائی کے کام بھی آسانی سے انجام پاتے رہتے ہیں۔ مثلاً کسی صاحب کی ڈیوٹی مقرر کر دی جاتی ہے کہ وہ فلاں جگہ اسکول کے بچّوں کو سڑک پار کرا دیا کریں۔ اس طرح ان لوگوں کے ہاتھ پاؤں چلتے رہتے ہیں اور ان کو خوشی بھی حاصل ہوتی رہتی ہے۔ خدمت بجائے خود ایک خوشی ہے اور کام ایک ٹانک ہے۔ میں اپنے شہر میں دیکھتا ہوں کہ بعض رِٹائر لوگ صبح سے شام تک پلنگ یا کرسی توڑتے رہتے ہیں اور دوسروں کا وقت خراب کرتے رہتے ہیں۔ نہ ان کو خدمت کی خوشی میسر ہے اور نہ کام کا ٹانک ملتا ہے۔ حال آنکہ دونوں مفت کی چیزیں ہیں۔

کسی شہر کو اچھی طرح دیکھنا سمجھنا ہو تو اس کا طریقہ یہ نہیں ہے کہ فرّاٹے بھرتی ہوئی کار میں بیٹھ کر ایک جگہ سے دوسری جگہ چلے گئے۔ ہر شہر کا ایک مزاج ہوتا ہے اور اس کو سمجھنے کے لیے "پاؤں پاؤں" چلنا ضروری ہے۔ اس طرح سڑکوں، بازاروں، دُکانوں، پارکوں اور مختلف جگہوں کے علاوہ وہاں کے لوگوں کو بھی قریب سے دیکھنے، سمجھنے اور پہچاننے کا موقع ملتا ہے۔

میں لندن میں کئی بار تنہا بھی گھومنے کو نکلا۔ ٹیوب میں بھی سفر کیا، ٹیکسی میں بھی اور کچھ دُور پیدل بھی پھرا۔ اجنبیوں سے بھی ملا۔ دُکان داروں کے طریقے اور گاہکوں کے اطوار بھی دیکھے۔ ایک فقیر بھی مِلا۔ کالا نہیں گورا ہی تھا۔ میں اپنے میزبان جناب یوسف حسین نقوی کی قیام گاہ ڈریک فیلڈ روڈ سے قریب ایک بازار

کی فُٹ پاتھ پر چلا جا رہا تھا۔ میں نے دیکھا کہ مخالف سمت سے ایک آدمی آرہا ہے۔ وہ میرے آگے جاتی ہوئی دو لڑکیوں کے پاس رُکا، اُن سے کچھ کہا اور اُن کا جواب سُن کر آگے بڑھا تو میں قریب پہنچ چکا تھا۔ مجھ سے کہنے لگا کہ کیا آپ مجھے چائے پینے کے لیے دس پنس دے سکتے ہیں۔ ایک سیکنڈ کے لیے میرے دل میں خیال آیا کہ میں جیب سے پرس نکالوں اور یہ چھین کر چلتا بنے تو؟ لیکن پھر میرا ہاتھ شیروانی کی نیچے کی جیب میں گیا، جس میں کھلے پیسے تھے۔ میں نے دس پنس کا سکّہ اس کے حوالے کیا، وہ شکریہ، بہت بہت شکریہ کہتا ہوا روانہ ہو گیا۔ شکریہ کہنا تو انگریزوں کی عادت ہے۔ بات بات پر شکر گزاری کا اظہار کرتے ہیں۔ میں نے ایک چوراہے کے قریب ایک بڑے میاں سے ڈاک خانے کا پتا پوچھا۔ انھوں نے بڑی دل چسپی سے پتا بتایا اور پھر اُلٹا میرا شکریہ ادا کیا۔

شکریے پر ایک لطیفہ سُن لیجیے۔ ایک انگریز کی بیوی کا انتقال ہو گیا۔ صدمہ بہت ہوا، لیکن کیا کر سکتا تھا۔ آخری رسوم کے تمام انتظامات کیے۔ آخری بار منھ دیکھ کر جب تابوت (میت کا صندوق) بند کرنے لگا تو بے اختیار اس کے منھ سے نکلا، "تھینک یو۔"

شوکت تھانوی مرحوم نے بھی ایک لطیفہ سُنایا تھا۔ کہنے لگے کہ ہم ایک زمانے میں حفیظ جالندھری صاحب کے ماتحت تھے۔ ایک روز اُن کے گھر بیٹھے تھے۔ ان کی انگریز بیگم بھی بیٹھی تھیں۔ حفیظ صاحب نے انگریزی میں کچھ فرمایا۔ انگریزی غلط تھی اس لیے مجھے ہنسی آئی، مگر میں نے ہنسی روک لی اور مسکرا کر رہ گیا۔ تھوڑی دیر میں حفیظ صاحب کسی کام سے اُٹھ کر گھر کے اندر گئے تو ان کی انگریز بیگم نے پوچھا، "مسٹر شوکت! آپ ابھی کیوں ہنستا تھا؟" میں نے بہت ٹالنا چاہا، مگر وہ سمجھ چکی تھیں، کہنے لگیں کہ ہم سمجھ گیا، آپ حفیظ کی انگریزی پر ہنستا تھا۔ مجھے اقرار کرتے بن پڑی۔ تو انھوں نے کہا کہ نہیں، اب تو حفیظ کا انگریزی بہت اچھا ہو گیا ہے۔ جب ہمارا نئی نئی شادی ہوا تھا اور میں صبح اُٹھ کر کہتی، "حفیظ! گُڈ مارننگ"، تو حفیظ جواب میں کہتے، "تھینک یو۔"

خیر، بڑے میاں کے شکریہ ادا کرنے پر میں بہت دیر تک سوچتا رہا کہ تہذیب کسے کہتے ہیں۔ تہذیب تو خیر بہت بڑا لفظ ہے۔ ہماری زبان میں ایک اور لفظ ہے "شائستگی"۔ کتنا پیارا لفظ ہے۔ اس کے معنی میں تہذیب، اخلاق، مروت، قابلیت، لیاقت شامل ہیں، لیکن یہ لفظ میرے نزدیک ان سب سے بڑھ کر ہی ہے۔ انگریزی میں ایک لفظ بولتے ہیں پولائٹ نس POLITENESS۔ اردو میں شائستگی ہی سے اس کا مفہوم ادا ہو سکتا ہے۔ محض نرمی، نرم خوئی، خوش اخلاقی یا خوش مزاجی میں وہ وسعت

نہیں ہے جو شائستگی میں ہے۔ تو میں سوچتا رہا کہ شائستگی کیا صرف مغربی لوگوں کے حصّے میں ہی آئی ہے۔ خدا نہ کرے کہ آپ پاکستان میں کسی سے پتا پوچھ لیں۔ چاہے آپ منزل سے قریب ہی کھڑے ہوں، مگر پتا بتانے والے آپ کو بھٹکا کر اور دُور کر دیں گے۔ اگر پتا نہ معلوم ہو اور ہم تلاش میں مدد دینے کے لیے وقت نہ بھی نکال سکیں تو ہم اپنی ناواقفیت کا اظہار تو کر ہی سکتے ہیں، لیکن ہم یہ بھی نہیں کرنا چاہتے۔

میرے دماغ میں کھچڑی پکنے لگی۔ میں لندن کی ایک فُٹ پاتھ پر چلتے ہوئے خیالوں میں پاکستان پہنچ گیا۔ ہمارا دعوا ہے کہ ہمیں منزل معلوم ہے، صحیح راستہ بھی صرف ہم ہی جانتے ہیں، لیکن واقعہ یہ ہے کہ ہم منزل کے قریب کھڑے ہیں اور پھر بھی بھٹک رہے ہیں۔ بھٹکنا اور بھٹکانا ہماری عادت بن گئی ہے۔ ہم اس خوش فہمی میں ہیں کہ ہمیں منزل معلوم ہے، اس لیے کسی سے پتا کیوں پوچھنے لگے۔ لہٰذا منزل سے اور دُور ہو جاتے ہیں۔ میں بھی خیالات کی دنیا میں زیادہ بھٹکتا تو لندن کے بازاروں میں سچ مچ راستہ بھٹک جاتا یا کسی سے ٹکر ہو جاتی، لہٰذا خود کو شائستہ بنانے کی کوشش کرنے لگا۔

لندن میں بھی لوگ بھیک مانگتے ہیں۔ واقعی! کہیں یہ بھی خیال کا کرشمہ تو نہیں ہے، مگر نہیں میں نے خود ابھی فقیر کو دس پنس کا سکّہ تھمایا ہے۔ یہ حقیقت ہے کہ بھکاری پن مجبوری کا نام نہیں ہے، بلکہ بُری عادت یا خراب ذہنیت بھیک منگواتی ہے۔ غیرت مند آدمی چاہے کتنا ہی ضرورت مند ہو کسی کے آگے ہاتھ نہیں پھیلائے گا۔ جس نے ہاتھ پھیلا لیا وہ تو نہ غیرت مند رہا اور نہ غریب۔ انگلستان میں تو ہر بے روزگار کو الاؤنس ملتا ہے اور جب تک آدمی کو کام نہیں مل جاتا الاؤنس ملتا رہتا ہے۔ تو پھر بھوکے مرنے کا کیا سوال۔ وہاں اگر کوئی بھیک مانگتا ہے تو وہ خود اس کا ذمہ دار ہے، معاشرے کو بُرا نہیں کہا جا سکتا۔ پاکستان میں معاملہ اس کے برعکس ہے۔ یہاں اگرچہ زیادہ تر لوگ فاقے کی بنا پر نہیں بلکہ فاقہ مستی کی وجہ سے بھیک مانگتے ہیں اور خوب دولت جمع کرتے ہیں، لیکن پھر بھی ہم یقین سے نہیں کہہ سکتے کہ کون مجبور ہے اور کون بے غیرت۔ ہم نے امیر بننے اور امیری کی شان دکھانے کے شوق کو اتنا بڑھا لیا ہے کہ اگر ہمیں کوئی "مال دار بھکاری" کہے تو ہم شاید اس سے بھی خوش ہوں گے۔ اب اس دوڑ میں کوئی اِکّا دُکّا کم زور لوگ بھی ہیں۔ یہ وہ لوگ ہیں جو محنت، دیانت اور لیاقت کے بہکائے میں آ کر پیچھے رہ جاتے ہیں اور پریشان ہونے کے علاوہ سب کے بُرے بھی بنتے ہیں۔ بھوک تو واقعی بھیک منگوا دیتی ہے۔ حضورؐ کا ارشاد ہے کہ مفلسی انسان کو کُفر کے قریب لے جاتی ہے۔ اگر ہم ایسا نظام قائم کر دیں کہ کوئی شخص بھوکا نہ مرے اور ہر تن درست آدمی کو کام ملے تو بھیک ہی نہیں بہت سی دوسری برائیاں

بھی دُور ہو جائیں۔ انگلستان میں فقیر اِکا دُکا ہیں۔ ہمارے ہاں کمی نہیں اور بہت سے امیر بھی اندر سے فقیر ہیں۔

دس پنس کے سکّے پر یاد آیا کہ یورپ کے ملکوں میں سکّوں کا رواج بہت ہے۔ نوٹ بھی چلتے ہیں، لیکن دھات کے سکّے بھی خاصے بھاری ہیں۔ فرانس میں تو بیس بیس فرانک تک کے سکّے ہیں۔ ہمارے ہاں تو ایک رُپے کا بھی سکّہ مقبول نہیں ہوتا۔ وہ بھی ہماری طبعِ نازک پر بار ہوتا ہے۔ مجھے یاد ہے کہ شاید گزشتہ سال ایک رُپے کے سکّے بازار میں نظر آئے تو بعض دُکان داروں نے انکار کر دیا کہ یہ تو بند ہو چکا ہے۔ ہاں کھوٹے سکّے خوب چلتے ہیں۔ ہم کھوٹا سکّہ چلا کر بہت خوش ہوتے ہیں، لیکن جب ہوتے ہوتے وہ پھر اتفاق سے ہمارے پاس پہنچ جاتا ہے تو ہم بہت ناخوش ہوتے ہیں اور کھوٹا سکّہ دینے والے کو بہت بُرا بھلا کہتے ہیں۔ یہی حال ہر برائی کا ہے۔ ایک بار کوئی اُسے میدانِ عمل میں ڈال دے۔ وہ بُرائی پھیلتے پھیلتے اسی آدمی کے پاس پہنچ جائے گی۔

لندن میں جگہ جگہ "لانڈریاں" ہیں۔ ان میں کپڑے دھونے کی کتنی مشینیں لگی ہیں۔ آپ جائیے۔ تیس پنس دیجیے اور مشین میں ڈال کر اپنے کپڑے خود دھو لیجیے اور استری کرنی ہو تو گھر لا کر استری کر لیجیے۔ لندن میں جب میرے دو تین جوڑے میلے ہو گئے تو میں بغل میں کپڑے داب کر نکلا۔ اپنے وطن میں تو کوٹ پتلون بھی پہن لیتا ہوں، لیکن یورپ میں صرف شیروانیاں لے کر گیا تھا۔ حکیم صاحب تو خیر انگریزی لباس پہنتے ہی نہیں۔ ساری دنیا میں سفید شیروانی میں ہی سفر کرتے ہیں۔ خیر میں کپڑے لیے ہوئے قریب کی ایک دُکان پر پہنچا۔ دو عورتیں تھیں۔ اُن کو میں نے راضی کر لیا کہ میں کپڑے چھوڑ جاؤں تو وہ شام تک خود دھو دیں گی۔ میرا مقصد یہ تھا کہ اس طرح مجھے بازار میں پھرنے کے لیے ذرا زیادہ وقت مل جائے۔ شاید چھے کپڑوں کی دُھلائی ایک پونڈ ساٹھ پنس وصول کی۔ واپسی پر جب شام کو میں کپڑے لینے گیا تو انھوں نے غلطی سے مجھے ایک کپڑا زیادہ دے دیا، جو میں نے اُن کو واپس کر دیا کہ یہ میرا نہیں ہے۔

لندن کے بازار میں ایک دُکان پر پلنگ کی چادریں کچھ اس وضع اور رنگوں کی تھیں جیسی ہمارے ہاں عام ہوتی ہیں۔ وہاں لوگ بڑے شوق سے خرید رہے تھے۔ معلوم ہوا کہ افریقہ سے آتی ہیں۔ اسی دُکان پر چند سوٹ کیس بھی رکھے تھے اور کچھ مصنوعی زیور بھی۔ یعنی سونے نُما دھات کے بنے ہوئے ہار، بندے وغیرہ وغیرہ۔ یہاں سے میں نے چند بُندے وغیرہ خریدے۔

۱۰

ذرا پیدل چلا تو کچھ تھک گیا اور عادت کے مطابق پہلا خیال یہ آیا کہ چائے پینی چاہیے، مگر پھر خیال آیا کہ کسی ہوٹل میں بیٹھا تو گھنٹہ آدھ گھنٹہ ضائع ہو جائے گا۔ چناں چہ پھلوں کی ایک دُکان سے ایک سیب اور دو کیلے خریدے، ۳۲ پنس میں۔ پھل سستے معلوم ہوئے جیسے کوئی ۳۲ پیسے میں مل گئے ہوں، مگر غور کیا تو ہمارے لحاظ سے وہ سات رُپے کے ہو گئے تھے۔ یہ تو بہت مہنگے ہوئے۔ کراچی میں تو یہ پھل دو رُپے میں مل جاتے۔ مہنگی تو ہر چیز ہی ہے۔

مہنگائی بھی لوگ زیادہ تر خود ہی پیدا کرتے ہیں۔ سہولتیں زیادہ چاہتے ہیں۔ ہمیں یہ بھی ملے، وہ بھی ملے۔ ہمارے پاس یہ بھی ہو اور وہ بھی ہو۔ اس کے لیے پیسہ زیادہ چاہیے۔ پیسہ زیادہ ہونے

جناب یوسف حسین نقوی اپنے لندن کے گھر میں (فوٹو: مصنف)

کا مطلب مہنگائی ہے۔ دواؤں کے کارخانے کے کارکنوں کی تنخواہیں بڑھتی ہیں تو دوائیں مہنگی ہو جاتی ہیں اور کپڑے کے کارخانے کے مزدوروں کی اُجرت بڑھنے سے کپڑا مہنگا ہو جاتا ہے۔ دواؤں والے کارکن جب کپڑا خریدنے جاتے ہیں تو اُن کو کپڑا مہنگا ملتا ہے اور کپڑے کے کارخانے والوں کو دواؤں کے زیادہ دام دینے پڑتے ہیں۔ نتیجے میں تنخواہوں میں اضافہ بے کار ہو جاتا ہے اور کارکنوں کی زندگی جیسی پہلے تھی ویسی ہی رہتی ہے۔ ان کی زندگی کا معیار نہیں بڑھتا۔ نیدرلینڈ میں کوئلے کی کانیں ہیں، لیکن وہ کوئلا دوسرے ملکوں انگلستان وغیرہ سے درآمد کرتے ہیں، کیوں کہ اگر خود اپنی کانوں سے کوئلا نکلوائیں تو ان کو مہنگا پڑے، کیوں کہ وہاں مزدور مہنگے ہیں۔

مہنگائی ساری دنیا میں ہے اور اس کو قابو رکھنے کی صورت یہ ہے کہ محنت اور معاوضے میں توازن رکھا جائے۔ آمدنی کتنی ہی زیادہ ہو اگر خرچ میں سلیقہ نہ ہو اور کفایت کی عادت نہ ہو تو زیادہ آمدنی رحمت کے بجائے زحمت بن جاتی ہے۔ اصل میں دولت سے راحت نہیں ملتی بلکہ محنت کا دوسرا نام راحت ہے۔ یورپ کے ملکوں میں معمولی سودا لو تو اس کے ساتھ تھیلا نہیں دیتے۔ وہاں کاغذ کی تھیلیوں کے بجائے کاغذی پلاسٹک کے تھیلوں کا رواج عام ہے۔ اس قسم کے تھیلوں کا رواج اب کراچی میں بھی ہو رہا ہے۔ یہ خاصا کم زور ہوتا ہے۔ یورپ میں دو پیسے کا ملتا ہے، لیکن کفایت کے عادی لوگ وہ بھی کئی کئی بار استعمال کرتے ہیں۔ دو پیسے بھی کیوں فضول خرچ کریں۔

اچھی عادتوں سے انسان کی زندگی بنتی ہے۔ جس قوم میں اچھی عادتوں کے لوگ کثرت سے ہوں وہ قوم بھی خوش حال ہوتی ہے۔ جس قوم کے زیادہ لوگ بُری عادتوں میں مبتلا ہوں اس قوم میں اچھی عادتوں والے لوگ پیدا ہونے مشکل ہو جاتے ہیں، کیوں کہ اچھے لوگ کم تعداد میں ہوتے ہیں اور قوم کے اکثر لوگوں کو وہ پسند نہیں آتے، اس لیے ان کی قدر نہیں ہوتی بلکہ ان کو قدم قدم پر رُکاوٹیں پیش آتی ہیں۔ میرا دل اس خیال سے پریشان ہو جاتا ہے کہ ہماری قوم کچھ ایسے ہی حالات میں گھر رہی ہے۔

اچھی عادتوں سے میری مراد اس قسم کی عادتوں سے ہے جیسے محنت کی عادت، دیانت کی عادت، کفایت کی عادت، خدمت کی عادت۔

لندن، اوکسفرڈ، کیمبرج اور پیرس میں، میں نے لوگوں کو مستعد اور محنتی پایا۔ وہ جو کام بھی کرتے ہیں بڑے خلوص اور استقلال سے کرتے ہیں اور اس کام میں مہارت حاصل کرتے ہیں۔ ان کو

آسانی سے پیسہ یا نام کمانے کی جلدی نہیں ہوتی۔ اس لیے ان کی ساری توجہ کام پر رہتی ہے اور وہ چوری اور کام چوری دونوں سے بچے رہتے ہیں۔ محنت اور کام کو عیب نہیں سمجھا جاتا۔ عورت، مرد یہاں تک کہ بچے بھی کام کرتے ہیں۔ دُکانوں پر آپ کو مردوں کے ساتھ عورتیں بھی نظر آئیں گی۔ اس طرح خاندان کا بوجھ کسی ایک فرد پر نہیں ہوتا اور اگر کسی خاندان کا سرپرست بیمار یا بے کار ہو جائے یا دنیا ہی سے رخصت ہو جائے تو اس کے گھر والے بھیک مانگنے یا بھوکے مرنے پر مجبور نہیں ہوتے۔ یوں بھی قوم کے آدھے حصّے کو بے کار رکھنا کسی لحاظ سے بھی اچھا نہیں ہے۔ ہمارے ہاں لڑکیوں کی تعلیم تو اب عیب نہیں رہی اور شہروں میں تو لڑکیاں بڑھ چڑھ کر پڑھ رہی ہیں، لیکن اُن کی تعلیم کام نہیں آتی۔ شادی کے بعد زیادہ تر لڑکیاں چولھے چکّی تک محدود رہ جاتی ہیں۔ بے شک یہ کام بھی ضروری ہیں اور عورتوں کا تو یہ ایک طرح سے زیور ہیں۔ پھر گھر کی خوشی اور خوش حالی میں تو ان کاموں کا بڑا دخل ہے، لیکن ان کے علاوہ بھی لڑکیوں کو ایسے کام کرنے چاہییں جس سے اُن کی آمدنی بڑھے اور اُن کی صلاحیتوں سے ملک کو فائدہ پہنچے۔ آمدنی بڑھانا صرف اپنے یا اپنے خاندان کے لیے ہی ضروری نہیں ہے بلکہ یہ قوم کی بھی ضرورت ہے۔

لندن کا مشہور تاریخی بگ بن (گھنٹہ گھر) اور پارلیمنٹ کی عمارتیں۔

آمدنی بڑھانے کا مطلب ہے محنت کرنا اور مہارت کو کام میں لانا۔ ظاہر ہے کہ محنت اور مہارت ملک و قوم کے لیے ہر لحاظ سے مفید ہیں۔

اگر کسی خاندان کے پاس دولت خوب ہو تب بھی اس کے افراد کو کام کرنا چاہیے۔ سُستی اور بے کاری میں وقت ضائع کرنا کسی حال میں مفید نہیں ہے۔ پیسے کے لیے نہیں تو اعزازی کام کریں۔ بلامعاوضہ خدمت کریں۔ اَن پڑھ لوگوں کو تعلیم دیں یا معاوضہ لے کر کام کریں اور جو آمدنی ہو وہ فلاحی کاموں میں خرچ کریں۔ بے کار رہنا سو عیبوں کا ایک عیب ہے۔ اس سے ہزاروں اخلاقی برائیاں اور کمزوریاں پیدا ہوتی ہیں۔ محنت کی کمی بہت سی خرابیوں کی جڑ ہے اور خاص طور پر ہماری قوم کو تو ابھی محنت کی بہت ضرورت ہے۔

ہمیں دوسری قوموں سے یہ محنت اور دیانت کا سبق حاصل کرنا چاہیے۔ ان میں جو برائیاں ہیں ہم ان کو نہ اپنائیں، لیکن جو خوبیاں ہیں وہ ضرور اپنا لیں۔ مثال کے طور پر وہ کھانے پینے کی چیزوں میں ملاوٹ نہیں کرتے۔ قانون بھی بہت سخت ہے اور لوگ خود بھی اس کو اخلاقی طور پر بہت بُرا سمجھتے ہیں۔ مجال ہے جو کسی چیز میں ملاوٹ کر دیں۔ اب یہ کتنی اچھی بات ہے۔ ہمارے ہاں تو ملاوٹ کے بغیر کسی کو کوئی چیز مل جائے تو اس کا بڑی خوشی سے ذکر کیا جاتا ہے۔ مثلاً "آج کل تو ہمیں دودھ بالکل خالص مل رہا ہے۔"

لندن میں تو کھانے کی چیزیں خالص ہونے کے علاوہ صاف ستھری بھی ہوتی ہیں۔ گوشت دُکانوں پر رکھا ہوا دیکھو تو اتنا صاف بلکہ شفاف کہ کچّا ہی کھانے کو جی چاہے۔ معلوم نہیں وہ کس طرح صاف کرتے ہیں اور کس خوب صورتی سے کاٹتے ہیں۔ کیا کوئی ایسی صورت نہیں ہو سکتی کہ ہمارے ہاں کے قسائیوں کو لندن بھیج کر گوشت کاٹنے، بنانے، صاف کرنے اور پیک کرنے کی تربیت دلائی جائے؟

سیب اور کیلے کھا کر یہ سوچتا ہوا آگے چلا کہ اب تو گھر کھانے کا وقت ٹلا کر ہی جانا ہے، ورنہ ہمارے میزبان سید یوسف حسین نقوی صاحب اور ان کی بیگم کھانا نہ کھانے پر ناراض ہوں گے۔ دونوں نہایت مہمان نواز اور متواضع ہیں، بلکہ اُن کے تمام لڑکے اور بہو بھی مسافر نوازی میں پورے پورے مشرقی ہیں۔ نقوی صاحب کے پانچ لڑکے ہیں، لڑکی کوئی نہیں ہے۔ خضر پی آئی اے میں ہیں۔ باقر شپنگ کمپنی میں ملازمت کرتے ہیں۔ اطہر اپنے دو بھائیوں قمر اور

حبیدر کے ساتھ تجارت کرتے ہیں۔ انھوں نے کیمبرج میں اپنا گھر بھی بڑا اچھا بنایا ہے جو کیمبرج شہر سے بھی کچھ آگے ہی ہے، لیکن اتنی شاداب، پُرسکون اور کھلی فضا ہے کہ میرا دل چاہا کہ میں وہیں رہ جاؤں۔ ایک دن ہم نے دوپہر کا کھانا وہیں کھایا تھا۔ میں نے حکیم صاحب سے کہا کہ دو سال کے لیے مجھے یہیں چھوڑ جائیے۔ دو سال میں، میں یہاں رہ کر یکسوئی سے ایک بہت اچھی کتاب لکھ سکتا ہوں۔ حکیم صاحب نے کہا کہ واقعی بڑی پُرفضا جگہ ہے۔

نقوی صاحب ۲۵-۲۶ سال سے لندن میں ہیں۔ پہلے پاکستان کے سفارت خانے سے متعلق تھے، بعد میں برطانوی حکومت کے ایک محکمے میں ملازم ہو گئے اور لندن ہی میں مستقل سکونت اختیار کر لی۔ اب رٹائر ہیں۔ انھوں نے بہت کوشش کی کہ حکومتِ برطانیہ ہمدرد کی دوائیں درآمد کرنے کی اجازت دے دے، لیکن معلوم نہیں وہاں کی حکومت کو ان دواؤں میں کیا زہر نظر آیا کہ اجازت نہیں دی۔ حال آنکہ لاکھوں لوگ خاص طور پر پاکستان ہندستان کے لوگ مشرقی (یونانی) دواؤں سے اپنا علاج کرانا چاہتے ہیں اور جناب حکیم محمد سعید صاحب جب بھی لندن جاتے ہیں مریض ٹوٹ پڑتے تھے۔ ان کے لیے دواؤں کی ضرورت ہوتی تھی، لیکن دوائیں کہاں سے آتیں۔

لندن کا بگ بن بہت مشہور ہے۔ یہ ۳۱۶ فیٹ اُونچے گھنٹہ گھر میں کوئی سوا سو سال پہلے ۱۸۵۸ء میں لگایا گیا تھا۔ اس کو بڑی اہمیت دی جاتی ہے۔ اس کا وزن ۱۳ ٹن ہے۔ اس کا نام سر بن جامن ہال کے نام پر رکھا گیا تھا، لیکن مجھے اس نے خاص متاثر نہیں کیا، ہاں انگریز جس طرح وقت کی قدر کرتے ہیں اس نے بہت متاثر کیا۔ انسان کو اگر وقت کی قدر و قیمت معلوم ہو تو گھڑی اس کی مدد کر سکتی ہے۔ گھڑی انسان کو وقت کا پابند نہیں بنا سکتی۔ انسان چاہے تو گھڑی سے کام لے سکتا ہے۔ بے پروا اور وقت سے غافل لوگوں کو نہ گھڑی کی سوئی چونکاتی ہے اور نہ گھنٹے کی صدا جگاتی ہے۔ ہاں وقت کا شعور رکھنے والے لوگ اپنی گھڑی کو صحیح رکھتے ہیں۔ اصل چیز انسان اور اس کا شعور ہے۔ باشعور انسان نے ہی گھڑی ایجاد کی اور وہ اس سے مدد لے کر وقت کو ضائع ہونے سے بچاتا ہے۔ اگر انسان کو وقت کا احساس نہیں ہوتا اور اس کی قدر ہی نہیں معلوم ہوتی تو وہ وقت ناپنے کا آلہ ہی کیوں ایجاد کرتا۔ میں بعض لوگوں کو دیکھتا ہوں کہ اُن کے ہاتھ پر گھڑی بندھی ہوتی ہے، مگر وہ اس سے آنکھیں چُرا کر بڑی فراخ دلی سے ضائع کرتے رہتے ہیں۔

۱۱

لندن اور پیرس دونوں جگہ ایک بات یہ ہے کہ چیزیں خریدنے میں وقت نہیں لگتا۔ دُکان چھوٹی ہو یا بڑی آپ داخل ہوں۔ دُکان دار اپنی جگہ بیٹھا رہے گا۔ بڑا اسٹور ہوگا تو بہت سے سیلز مین ہوں گے، مگر سب اپنی جگہ بیٹھے یا کھڑے رہیں گے۔ ہاں آپ مدد چاہیں گے تو ضرور مدد کریں گے۔ ویسے آپ خود ہی گشت لگا کر چیزوں کا انتخاب کریں اور پسند آجائیں تو اُٹھا بھی لیں۔ ہر چیز پر قیمت کی چِٹ لگی ہے، اس لیے دِل میں پریشان ہونے کی ضرورت بھی نہیں ہے کہ آپ کو چیز پسند تو ہے، مگر دیکھیے وہ کیا دام مانگتا ہے اور چوں کہ چیز پسند آچکی ہے اس لیے دام زیادہ ہی مانگے جائیں گے۔ وہاں تو جو قیمت لکھی ہے وہ دے دیجیے اور چلے آئیے۔ پاکستان ہندُستان کے لوگوں کو وہاں خریداری کا مزہ نہیں آتا۔ یہ کیا بات ہوئی کہ پہلی بار ہی صحیح قیمت بتا دی، نہ سودا چُکانے کا موقع دیا اور نہ یہ موقع دیا کہ ہم دُکان دار کو دھمکی دیں کہ اچھا ہم خریداری کے بغیر ہی واپس جاتے ہیں۔ کیسے روکھے دُکان دار ہیں لندن کے۔ لندن کی اکثر بڑی دُکانوں میں اور بعض چھوٹے اسٹوروں میں بھی ایک دو آئینے اس طرح لگے ہوتے ہیں کہ دُکان دار پر گاہک کی حرکات آئینہ ہوتی رہتی ہیں۔ ظاہر میں تو وہ اپنی گدّی پر بے نیاز بیٹھا ہوا ہے، لیکن ہر گاہک پر اُس کی نظر ہے۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ ہاتھ کی صفائی دِکھانے والوں سے لندن والے بھی ڈرتے ہیں۔ فرق یہ ہے کہ وہاں ایسے واقعات کم ہوتے ہیں، اور ہمارے ہاں ایمان داری کے واقعات نایاب ہیں۔

لندن اور پیرس کیا یورپ اور امریکا کے کسی ملک میں بھی کھانے پینے کی چیزوں میں ملاوٹ کا کوئی امکان نہیں ہے۔ ملاوٹ کا مطلب صحت سے کھیلنا ہے۔ صحت سے کھیلنے کی اجازت نہ وہاں کی حکومت دیتی ہے اور نہ پبلک۔ جو چیز لیجیے اطمینان سے کھائیے، اصلی ہوگی اور خالص۔

میں ایک دُکان میں گھسا تو دُکان دار نے بڑے لہک کر کہا، "السلام علیکم!" میں نے غور سے دیکھا کہ کوئی پاکستانی ہوگا، مگر نہیں، وہ انگریز ہی تھا۔ خیر میں سمجھا کہ وہ اردو یا عربی جانتا ہوگا، مگر جب اردو بولی تو اس نے بتایا کہ وہ بس اتنی ہی عربی جانتا ہے۔ اصل میں وہ میری شیروانی سے شاید یہ سمجھا کہ میں عرب ہوں اور عرب چوں کہ مال دار ہیں اور اچھے خریدار ہیں، اس لیے ان پر خصوصی توجہ ہونا فطری بات ہے۔

لندن کا ہر بازار بھی یکساں نہیں ہے، کہیں رونق زیادہ ہے اور کہیں کم۔ اسی لحاظ سے بارونق بازار مہنگے بھی ہیں اور قیمتوں میں خاصا فرق ہے۔ پاکستانی مسافروں کے لیے سستے بازار بھی کیا کم مہنگے ہیں، لیکن لندن کا شہر اسّی میل کے رقبے میں پھیلا ہوا ہے، اس لیے وہاں سستے بازار کی تلاش بھی تو سستی نہیں پڑتی۔ وقت کی بھی کمی ہوتی ہے اور صحیح خریداری اُسی وقت ہوسکتی ہے جب بازار کا ایک پھیرا تو صرف دیکھنے اور سمجھنے کے لیے کیا جائے۔ دوسرے پھیرے میں خریداری کی جائے۔ کتابوں کی خریداری کے لیے تو اور زیادہ وقت چاہیے۔

کتابیں ایسی چیز نہیں کہ اُن کی خریداری کے لیے صرف پیسہ کافی ہو۔ پیسے کے علاوہ شوق اور وقت اور ہمت بھی چاہیے۔ میرا خیال ہے کہ اگر کوئی بادشاہ بھی چاہے کہ پیسے کے بل پر چند دِنوں میں کتابوں کا عمدہ ذخیرہ جمع کرلے تو یہ ممکن نہیں ہے۔ اچھی کتاب ہر وقت نہیں ملتی، لہٰذا پیسے ہونے کے باوجود انتظار کرنا پڑے گا اور جہاں وہ کتاب ملے گی وہاں جانا پڑے گا۔

میں لندن کے جس بازار میں گیا وہاں کتابوں کی دُکانیں نظر آئیں اور میں نے ان دُکانوں میں جھانکا ضرور۔ ایک تو کتابوں پر نظر ڈالنا بھی چاہتا تھا، دوسرے چند کتابوں کی تلاش بھی تھی۔ بچّوں کی کتابوں کا بھی اندازہ کرنا تھا۔ بچّوں کی کتابیں وہاں جتنی عمدہ لکھی جاتی ہیں اتنی ہی عمدہ چھپتی بھی ہیں۔ بچّوں کے لیے ہر موضوع پر خاص طور پر سائنس پر کتابیں بڑی کثرت سے چھپتی ہیں۔ وہ ہر درجے اور ہر عمر کے بچّوں کے لیے سائنسی اور معلوماتی کتابیں اتنی خوب صورت، رنگین اور باتصویر شائع کرتے ہیں کہ وہاں کے بچّے ہمارے بڑوں سے زیادہ باخبر ہیں۔ کاش ہمارے ہاں بھی بچّوں کے ادب کی اہمیت کو سمجھا جائے۔ یہاں نہ لکھنے والے ہیں نہ تصویریں بنانے والے۔ بچّوں کے مصنّفوں، بچّوں کے مُصوّروں، بچّوں کے ناشروں سب

ہی کا قحط ہے۔ جو ادیب بچّوں کے لیے لکھتے ہیں وہ نہ معلومات کے صحیح ہونے کو ضروری سمجھتے ہیں اور نہ زبان کی صحت کا خیال رکھتے ہیں۔ بہرحال لندن میں بچّوں کی اتنی اچھی اور اتنی ساری کتابیں دیکھ کر آنکھیں کھُلیں اور دِل بُجھا۔

بڑوں کی کتابیں بھی دیکھیں، اُن کی تو کوئی انتہا ہی نہیں۔ ہمدرد نونہال اور ہمدرد صحّت کے خصوصی قلمی معاون جناب علی اسد کو میڈوز ٹیلر کی کتابیں پسند ہیں۔ اس کی ایک کتاب تو بہت مشہور ہے جو اس نے امیر علی ٹھگ پر لکھی ہے۔ اس کا اردو ترجمہ بھی ہو چکا ہے۔ ایک زمانے میں سُنا ہے یہ ترجمہ ہندُستان کے اکثر پولیس تھانوں میں رکھا رہتا تھا۔ انگریزوں کا مقصد شاید یہ ہو گا کہ پولیس والے ٹھگی کے طریقوں سے واقف ہو جائیں اور ٹھگوں کو پکڑ سکیں۔ میڈوز ٹیلر کی ایک اور دل چسپ ناول ہے جو اس نے ۱۸۵۷ء کی جنگِ آزادی کے پس منظر میں لکھی ہے۔ میں نے سوچا کہ اس کی کوئی اور کتاب یہاں مِل جائے تو علی اسد صاحب کے لیے لے لوں، پھر برادرم علی حسن (شعبۂ اشاعت ہمدرد کے سربراہ) نے بھی چند ضروری کتابوں کی فرمائش کی تھی، اس کی خاص طور پر تلاش تھی۔ اس کتاب کو تو میں نے ۳۵-۴۰ دُکانوں پر تو دیکھا اور پوچھا ہو گا، یہاں تک کہ فوائلس میں بھی دیکھی۔ فوائلس کے متعلق بعض لوگوں کا خیال ہے کہ دنیا کی سب سے بڑی کتابوں کی دُکان ہے۔ دنیا کی نہ سہی انگلستان کی تو سب سے بڑی دُکان ہے اور دنیا کے بھی چند بڑے کتب فروشوں میں سے ایک تو ضرور ہے۔ میں وہاں گھوما پھرا، اوپر نیچے گیا، پھر معلوم ہوا کہ دُکان کا ایک حصّہ گلی کے دوسری طرف بھی ہے وہاں بھی گیا اور تھک گیا۔

لندن اور پیرس دونوں جگہ میں نے کتابوں کی دُکانوں میں بچّوں کو بھی خاصی تعداد میں دیکھا۔ اچھا! بچّے کھلونوں کے علاوہ بھی کوئی چیز خریدنے بازار جاتے ہیں! خاص طور پر چھوٹے بچّوں کو کتابوں کی تلاش میں دیکھ کر بڑی ہی خوشی ہوتی ہے۔ مجھے کامل یقین ہے کہ جس بچّے کو کتاب سے دِل چسپی ہو جائے وہ بڑا ہو کر ضرور عالم بنے گا۔ کتاب انسان کو بدل کر رکھ دیتی ہے۔

ایک دن حکیم صاحب نے کہا کہ وقت کم ہو تو لندن دیکھنے کے لیے گائڈڈ ٹور اچھی صورت ہے۔ بعض ادارے اپنی بسیں چلاتے ہیں۔ اس قسم کی بعض بسیں دن بھر میں لندن شہر کے خاص خاص مقامات دِکھا دیتی ہیں۔ ہر بس میں ایک گائڈ ہوتی ہے جو ہر جگہ سے بلکہ

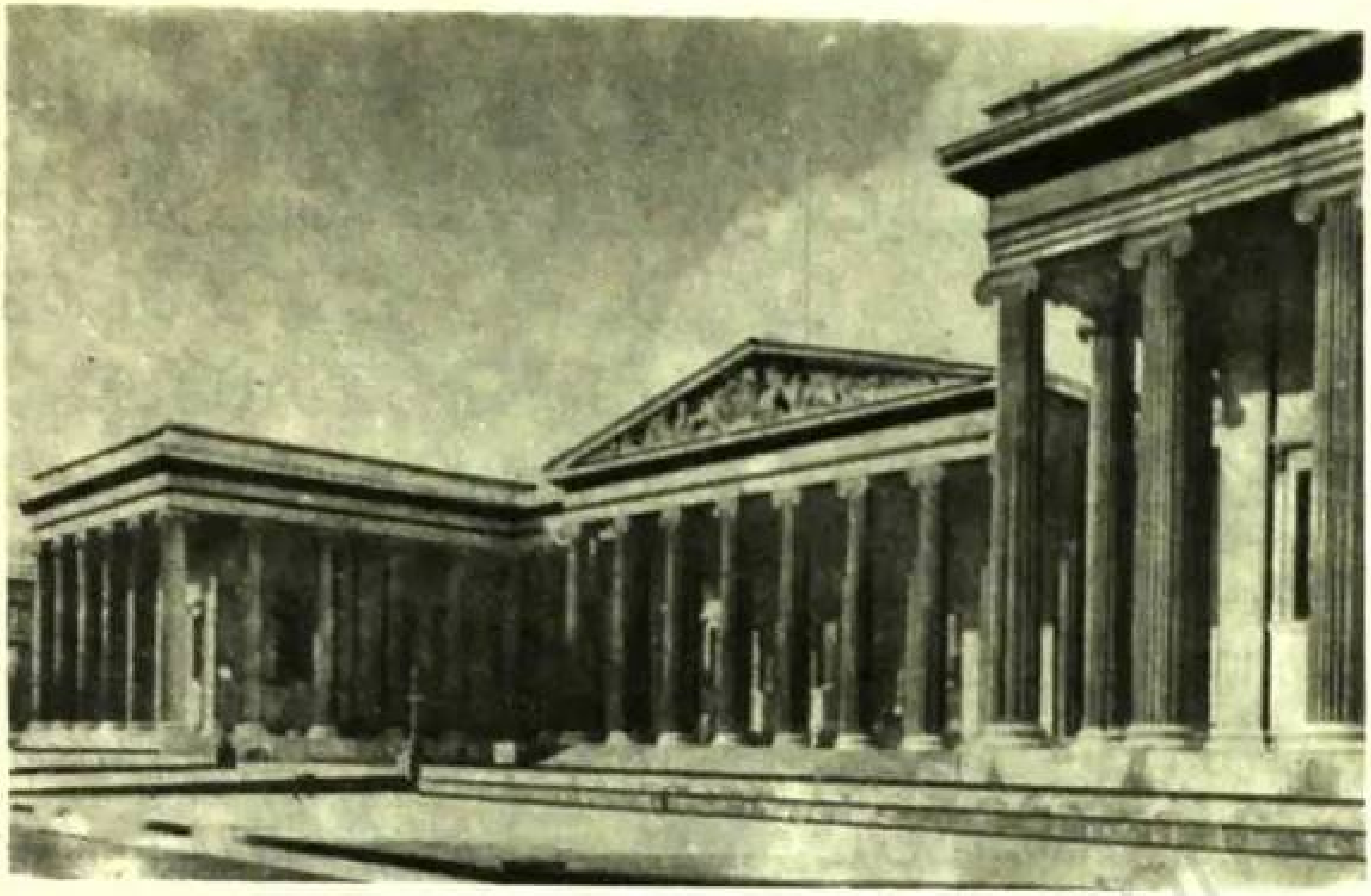

برٹش میوزیم کا بیرونی منظر

اس کی تاریخ سے بھی واقف ہوتی ہے اور سیاحوں کو بتاتی جاتی ہے۔ چناں چہ یوسف حسین نقوی صاحب کے صاحب زادے قمر میاں نے یہ زحمت اپنے ذمّے لی کہ وہ مجھے اس ادارے تک پہنچا دیں گے۔ ہم ٹیوب میں بیٹھے اور دو اسٹیشنوں پر گاڑی بدلتے ہوئے وکٹوریا اسٹیشن پر پہنچے۔ وہیں ایک ایجنسی کا دفتر تھا۔ پندرہ پونڈ کا ٹکٹ خریدا اور دوسرے دن کے لیے یہ ٹور مَیں کا ہوگیا۔ اس کے بعد پھر ٹیوب میں بیٹھے اور برٹش میوزیم پہنچے۔ وہاں سے میں نے قمر میاں کو رخصت کیا۔ ان کو دیر ہو رہی تھی، مگر مسافر نوازی میں انھوں نے اپنا کام پسِ پُشت ڈال دیا تھا۔

برٹش میوزیم — کہنے کو تو یہ ایک بڑا عجائب گھر ہے، لیکن سمجھ میں نہیں آتا اس کو کیا کہوں؟ تاریخ و تہذیب کا خزانہ؟ مگر مجھے "تاریخ کا خلاصہ" زیادہ صحیح معلوم ہو رہا ہے۔ اس میں کیا کچھ نہیں ہے۔ ہر وہ چیز محفوظ کرنے کی کوشش کی ہے جس سے انسان کی جدو جہد کا علم ہوتا ہے۔ زندگی میں سہولت پیدا کرنے، زندگی کو خوب صورت بنانے اور علم و دانش کو آگے بڑھانے کی جدو جہد کے راستے میں جو جو مرحلے اور منزلیں آئیں، اُن کے نشانات کو محفوظ کیا ہے۔

برٹش میوزیم کی عمارت ہی دیکھ کر اس کی وسعت، ضخامت اور بلندی کا اندازہ ہوتا ہے۔

بلند وبالا عمارت، بڑے بڑے کمرے، کمروں میں بڑے بڑے شوکیس جن میں بڑی حفاظت سے نادر چیزیں رکھی ہیں۔ میری دلچسپی یوں تو اور بھی نوادر میں تھی، لیکن پرانی کتابیں، بڑے بڑے مصنّفوں کی کتابوں کے پہلے ایڈیشن، خود مصنفوں کے ہاتھ کے لکھے ہوئے مسودے، تحریریں اور خط۔ ان کو دیکھ کر ایسا لگتا تھا جیسے ہم خود ان عظیم ادیبوں کو دیکھ رہے ہیں۔ میں تھوڑی دیر کے لیے اپنے کو بھی پرانے زمانے کا آدمی سمجھنے لگا۔ میرا دل چاہا کہ میں یہیں کسی شوکیس میں چُھپ کر بیٹھ جاؤں۔

برٹش میوزیم دیکھنے، سمجھنے کے لیے بہت وقت چاہیے۔ کتب خانے اور میوزیم، میلوں ٹھیلوں یا باغوں کی طرح صرف گھوم کر نظر ڈالنے کی چیز نہیں ہوتے۔ ان پر گہری نظر کی ضرورت ہوتی ہے۔ آدمی یکسوئی سے خاصا وقت دے تب ہی فائدہ ہے۔ جس طرح کسی نئے آدمی کو صرف دعا سلام اور مصافحہ کرنے سے آپ نہیں پہچان سکتے، بلکہ اس کے ساتھ بیٹھنے اور باتیں کرنے کی ضرورت ہوتی ہے اسی طرح کتب خانوں اور میوزموں کو بھی خوب اچھی طرح رُک رُک کر دیکھے بغیر فائدہ نہیں ہوتا۔ برٹش میوزیم تو عجائبات کا ایک سمندر ہے۔ اصل میں چاہتا تھا کہ حکیم صاحب قبلہ کے ساتھ دیکھوں۔ وہ کئی بار دیکھ چکے ہیں اور ان کی نظر ہے، لیکن حکیم صاحب مصروف تھے۔ لندن کے مریضوں نے بھی ان کو پریشان کر رکھا تھا۔ سچ ہے حکیم ڈاکٹر جنگل میں بھی بیٹھ جائے تو بھوکا نہیں مر سکتا۔ خیر حکیم صاحب کے معاملے میں کمانے کا تو مسئلہ نہیں تھا۔ انھوں نے کبھی زندگی میں فیس نہیں لی۔ یہاں تک کہ کسی کو گھر جا کر دیکھا تب بھی ایک پیسہ نہیں لیا حالانکہ بہت سے مریض تو پیش کش بھی کرتے ہیں اور چاہتے ہیں کہ وہ فیس قبول کر لیں۔ "جنگ" لندن میں خبر آ گئی تھی۔ اس لیے لوگ ٹوٹے پڑ رہے تھے۔ بہر حال جتنا ممکن تھا حکیم صاحب نے مریضوں کو وقت دیا۔

ایک دن میں صبح نقوی صاحب کے ہاں اپنے کمرے میں بیٹھا تھا کہ ایک خاتون داخل ہوئیں اور سلام کر کے قریب کی کرسی پر بیٹھ گئیں۔ میں بہت حیران ہوا مگر دل میں سمجھنے کی کوشش کرنے لگا کہ یہ پری رُو کہاں سے آن ٹپکی۔ آخر وہ گویا ہوئی: "حکیم صاحب، میری بہن کو بھی آپ ہی کے علاج سے فائدہ ہوا تھا، اس لیے میں دُعا مانگ رہی تھی کہ خدا آپ کو لندن بھیج دے....."

"اچھا آپ حکیم صاحب کو دِکھانے آئی ہیں۔ حکیم صاحب اُوپر ہیں، آئیے میں آپ کو وہاں تک پہنچادوں۔"

حکیم صاحب نے مجھے برٹش میوزیم میں اپنے دو جاننے والوں کے نام بتائے تھے اور اپنے کارڈ دے دیے تھے۔ وہ مِل جاتے تو بڑی مدد ملتی اور ناواقفیت سے جو وقت ضائع ہوتا ہے وہ نہیں ہوتا۔ جہالت کسی قسم کی بھی ہو بُری ہوتی ہے، لیکن افسوس مجھے وہ دونوں صاحبان نہیں مِل سکے۔ اُن کو تلاش نہ کر سکنے میں بھی میرا اناڑی پن ہی آڑے آیا۔ بہرحال میں جتنا گھوم کر دیکھ سکتا تھا گھوما پھرا اور پھر وہاں سے چند کتابچے اور "برٹش میوزیم کی کہانی" خریدی۔ کچھ کارڈ خریدے۔ بعض کارڈوں پر پرانی مشرقی کتابوں کے ٹائیٹل یا جِلد کا عکس چھپا ہوا تھا۔ اس کے بعد اوپر چڑھا۔ وہاں کچھ حصّے میں مرمت ہو رہی تھی۔ ایک بات پسند آئی۔ وہ مرمت بھی اس طرح کرتے ہیں کہ کم سے کم خلل پڑے اور لوگوں کو کم سے کم تکلیف ہو۔ شہر میں سڑکوں اور بعض عمارتوں کی مرمت کے سلسلے میں بھی میں نے یہی دیکھا۔ پھر خوبی یہ ہے کہ گندگی نہیں پھیلاتے اور جلد سے جلد مرمت کر کے صاف ستھرا کر دیتے ہیں۔ بعض وقت یہ بھی ہوا کہ کہیں جاتے وقت دیکھا کہ آدھی سڑک مرمت کی وجہ سے رُکی ہوئی ہے۔ کچھ دیر بعد واپسی ہوئی تو مرمت ہو چکی تھی۔ برٹش میوزیم میں بھی صفائی اور مرمت کے بہانے دیکھنے والوں کو بالکل روک ہی نہیں دیتے، بلکہ صرف محدود حصّے کو بند کر دیتے ہیں۔ اوپر کے کئی ہالوں میں جتنا دیکھ سکتا تھا دیکھا۔ پھر میوزیم میں جو کیفے ٹیریا ہے وہاں پہنچا۔ وہاں اپنی مدد آپ (سیلف سروس) تھی اور خوب بھیڑ تھی۔ میں بھی اپنی ٹرے لے کر قطار میں لگ گیا۔ چائے اور بسکٹ پر گزارا کیا۔ قیمت کم تھی، مگر پھر بھی اسّی پنس یعنی ۱۶ روپے پاکستانی تو لگ ہی گئے۔

چائے پی کر ذرا تھکن کم ہوئی تو دل چاہا کہ پھر ہمّت کروں اور دنیا کے اس قدیم ترین اور سب سے مشہور عجائب گھر کو اور دیکھوں، لیکن پھر سوچا کہ گھنٹے دو گھنٹے اور دیکھ بھی لیا تو کیا فرق پڑے گا۔

برٹش میوزیم کی بِنا ۱۷۵۳ء میں بُلومس بری میں پڑی۔ سرہنس سلون (HANS SLOANE) کے ذاتی ذخیرے سے اس کی ابتدا ہوئی۔ ان صاحب نے بڑی عمر پائی تھی۔ ۱۶۶۰ء میں پیدا

ڈاکٹر سر ہینس سلون

۱۶۶۰ء تا ۱۷۵۳ء

ہوئے اور ۱۷۵۳ء تک جیے۔ مانے ہوئے طبیب تھے۔ ان کے مریضوں میں جارج دوم اور ملکہ این بھی شامل تھی۔ سلون صاحب سر آئزک نیوٹن کے بعد رائل سوسائٹی کے صدر منتخب ہوئے۔ ان کو نادر چیزیں جمع کرنے کا بھی شوق تھا۔ برٹش میوزیم کی موجودہ عمارت کے قریب رہتے تھے۔ انھوں نے اپنے گھر میں پودوں، رکاز (فوسلس = FOSSILS) معدنیات، حیوانی اور طبی نمونے، مطبوعات، تصویریں، سکے، کتابیں اور مسودات کا ایک بہت بڑا ذخیرہ جمع کر رکھا تھا۔ مرنے سے دس سال پہلے سلون صاحب نے اپنا یہ بے مثال ذخیرہ چیلسی میں اپنے دیہاتی مکان میں منتقل کر دیا تھا اور وصیت کر دی تھی کہ صرف بیس ہزار پونڈ کے عوض یہ ذخیرہ میرے بتائے ہوئے اشخاص یا اداروں کو پیش کیا جائے۔ اُن میں سب سے پہلا نمبر جارج دوم کا تھا تاکہ وہ اس کو قوم کے فائدے کے لیے عام کر سکیں اور یہ شرط بھی تھی کہ اس کو پبلک کے لیے کھلا رکھا جائے۔ بڑی ردّوکد کے بعد جون ۱۷۵۳ء میں جارج دوم نے اس کی خریداری کی منظوری دی اور پارلیمنٹ نے اس سے متعلق قانون بنایا۔ اُس وقت اس ذخیرے کی چیزوں کی کل تعداد ۷۹۵۷۵ تھی۔ اس تعداد میں باغ نباتات کے پودے شامل نہیں ہیں۔ درحقیقت سلون صاحب نے بڑی فیاضی دکھائی

تھی ورنہ اس قیمتی خزانے کی قیمت کئی گنی زیادہ تھی۔ ان کی دو لڑکیاں تھیں، جن کو وصیت کے مطابق معاوضہ دیا گیا۔ اس طرح برٹش میوزیم کے بانی یا باپ سلون صاحب ہیں۔

اس کے پہلے پرنسپل لائبریرین جناب گوون نائٹ مقرر ہوئے تھے۔ اس کی ترقی میں ان کا بھی بڑا حصّہ ہے۔ سلون صاحب کے علاوہ رابرٹ اور ایڈورڈ ہارلے صاحبان کی قلمی کتابیں بھی خریدی گئیں۔ اس طرح برٹش میوزیم کی حیثیت ایک قومی اور عوامی ادارے کی ہو گئی اور جو جو لوگ اس سے وابستہ ہوتے گئے اس کو ترقی دیتے گئے۔ اب یہ بہت بڑی اور عجیب و غریب چیز ہو گئی ہے اور شاید دنیا کا کوئی پڑھا لکھا آدمی ایسا نہ ہو گا جس نے اس کا نام نہ سُنا ہو۔ جو پڑھا لکھا شخص لندن جاتا ہے اس کو دیکھنے کی ضرور کوشش کرتا ہے۔ اب یہ قانون بنا دیا گیا ہے کہ برطانیہ میں جو کتاب بھی شائع ہو اس کی ایک کاپی ایک مہینے کے اندر اندر برٹش میوزیم کو ضرور پیش کی جائے۔

میں نے یہ تھوڑا سا احوال اس لیے لکھا ہے کہ اگر شوق ہو تو ایک آدمی بھی کتنا بڑا کام کر سکتا ہے اور قوم کو کتنے فائدے پہنچا سکتا ہے۔ اب یہ قوم کی بھی خوبی ہے کہ اس نے

جناب گوون نائٹ

نہ صرف اس ذخیرے کی حفاظت کی بلکہ ایک مستقل اور بڑا ادارہ بنا دیا اور اس کو بے پناہ ترقی دی۔ انسان کی عمر تو محدود ہوتی ہے، لیکن ادارے ہمیشہ قائم رہ سکتے ہیں، اس لیے کسی قوم یا انسانیت کی بھلائی اس میں ہے کہ ادارے بنائے جائیں اور ان کو ترقی دی جائے۔ جس شخص میں کوئی اچھا کام کرنے کا جذبہ ہو اس کو یہ نہیں سوچنا چاہیے کہ میں اکیلا کیا کر سکتا ہوں۔ جتنی بھی ہمت ہو اور حیثیت ہو اس کے مطابق کام شروع کر دو، اس کے بعد دوسرے لوگ خود آگے آجائیں گے۔

اس وقت برٹش میوزیم کے ۹ بڑے بڑے شعبے ہیں، جس میں تقریباً ساری دنیا کے اہم آثار و باقیات کو محفوظ کرنے کی کوشش کی گئی ہے اور کی جاتی ہے۔ برٹش میوزیم میں ہر قوم اور ہر تہذیب کے اثاثے اور آثار جمع اور محفوظ کیے جاتے ہیں۔ اس میں عقیدے اور تہذیب کی کوئی قید نہیں ہے۔

برٹش میوزیم سے نکلا تو اس کے قرب و جوار میں جو نادر اور قدیم چیزوں کی دُکانیں ہیں انھوں نے دامن پکڑنا چاہا، مگر سفر میں بارہا دِل کو تھامنا پڑتا ہے۔ سفر آدمی کو بہت کچھ سِکھا دیتا ہے، بلکہ انسان بنا دیتا ہے۔ میں اُن سے اپنا دامن ہی نہیں جیب بھی بچاتا ہوا آگے بڑھ گیا، مگر کتابوں کی دُکانوں یا کتب خانوں کے سامنے سے گزر جانا میرے بس ہی میں نہیں ہے۔ چند دُکانوں میں ذرا ذرا رُکا، پھر ایک دُکان نظر آئی جس میں پرانی ہی پرانی کتابیں تھیں اور بہت تھیں۔ اس نے پیر پکڑ لیے۔ وہاں کوئی گھنٹہ بھر لگ گیا۔ اگر وقت ہوتا تو تلاش سے اس دُکان میں بہت سی اچھی اچھی کتابیں مل سکتی تھیں۔ ایسی دُکانوں میں دُکان دار بھی بعض اوقات پوری مدد نہیں کر سکتے۔ کئی بار تجربہ ہوا کہ دُکان دار نے کہہ دیا کہ یہ کتاب نہیں ہے، مگر میں نے خود وہ کتاب ڈھونڈ نکالی۔

اب میرا رُخ بی۔ بی۔ سی کی طرف تھا، جس کا دفتر بُش ہاؤس میں ہے۔ جناب اطہر علی سے ملنا تھا۔ ایک راہ گیر سے پوچھا تو اس نے بتایا کہ یہاں سے فاصلہ اتنا ہے کہ ہمت کرو تو پیدل جا سکتے ہو۔ چناں چہ ہمت کر لی اور گلیوں گلیوں چل پڑا۔ بُش ہاؤس کی بلند عمارت زیادہ دُور نہیں تھی۔ یاد نہیں رہا کہ کس منزل پر بی۔ بی۔ سی کی اردو سروس کا دفتر تھا۔ استقبالیہ نے اطلاع کی تو اطہر صاحب کی سکریٹری آکر مجھے ان کے کمرے میں لے گئی۔

لندن شہر کا ایک جزوی منظر۔
ٹریفلگر اسکوائر، نیشنل
گیلری اور واٹرلو
برج نظر
آرہے
ہیں۔

اطہر صاحب بڑی محبت اور تپاک سے ملے۔ بولے کہ کوئی تقریر نشر کر دیجیے۔ میں نے کہا کہ سفر طاری ہے، دماغ یکسو نہیں ہے، تو کہنے لگے اچھا پھر یونیسکو کوریئر کے ایڈیٹروں کی جس میٹنگ میں شرکت کرنے جا رہے ہیں اس کے بارے میں آپ کا انٹرویو کر لیتے ہیں۔ میں نے کہا کہ جیسی آپ کی مرضی، لیکن زیادہ مناسب تو یہ ہوگا کہ میٹنگ کے بعد تاثرات اور پروگرام وغیرہ پر اظہارِ خیال کروں۔ کہنے لگے کہ اچھا یوں ہی سہی۔ میں انتظام کردوں گا، پیرس میں ہمارا نمائندہ آپ سے مل لے گا اور وہیں یہ بات چیت رکارڈ کرلے گا۔ اطہر صاحب نے کہا کہ حکیم صاحب کو بھی اگر آپ کسی طرح راضی کرسکیں کہ وہ ایک تقریر نشر کرنے کے لیے وقت نکال لیں تو بہت اچھا ہو۔

بی۔ بی۔ سی کے دفتر ہی سے فون پر آصف جیلانی صاحب مدیر جنگ لندن سے بات ہوئی۔ ان سے اور اطہر صاحب سے ایک ایک وقت ان کے ساتھ کھانا کھانے کا وعدہ کر کے اجازت لی۔ آصف صاحب سے جنگ کا دفتر دیکھنے کا بھی ارادہ ظاہر کیا اور اطہر صاحب سے پتا سمجھنے کی بھی کوشش کی، لیکن پلّے نہیں پڑا۔ جب میں وہاں بیٹھا تھا تو عصر کا وقت تھا۔ چار بج چکے تھے۔ اور پاکستان میں آٹھ بج چکے ہوں گے۔ اردو سروس کا پروگرام شروع ہو چکا تھا۔ اطہر صاحب نے ریڈیو کھول کر کچھ دیر پروگرام سنایا بھی۔ وہاں وسیم صدیقی صاحب بھی تھے۔ ملنسار آدمی ہیں۔ مجھے پہچان گئے۔ خود بڑھ کر ملے۔ بی۔ بی۔ سی سے آوازتو خوب سن رکھی تھی، مگر ملاقات اُن سے پہلی بار ہی ہوئی۔

۱۲

سفر میں جگہ بدلنے کے ساتھ ساتھ سونے، جاگنے اور کھانے پینے کے اوقات اور انداز بھی بدل جاتے ہیں۔ ان سے موڈ بھی بدل جاتا ہے۔ انسان عادتوں کا غلام ہے اور سفر میں عادتیں پوری نہیں ہو سکتیں۔ سفر میں آدمی کو ہر وقت نئی صورتِ حال کے لیے تیار رہنا پڑتا ہے۔ میں زیادہ تر رات کو پڑھنے لکھنے کا عادی ہوں۔ دن کو لوگ وقت زبردستی چھین لیتے ہیں۔ اگر ملنے آئیں گے تو اپنی سہولت اور فرصت کے لحاظ سے۔ جس سے ملنے جا رہے ہیں اُس کے کام یا آرام کی فکر نہیں۔ گویا وہ تو ہر وقت فالتو بیٹھا ہے۔ بعض وقت تو کھانا کھانے کے لیے بھی سکون سے وقت نہیں ملتا، اس لیے مجبوراً رات کے سنّاٹے کو ہی کام میں لانا پڑتا ہے۔ سفر میں دن رات برابر ہوتے ہیں اور مسافر رات کو بھی سفر میں ہوتا ہے۔ چاہتا تھا کہ حکیم صاحب کی نقل میں، میں بھی ڈائری لکھ کر ہی رات کو بستر پر جاؤں، لیکن تھکن سے زیادہ بدلا ہوا ماحول موڈ بھی بدل دیتا ہے۔ تھکن کا بھی عجیب حساب ہے۔ آپ اگر معمول سے ہٹ کر تھوڑا کام بھی کریں تو معلوم ہوگا کہ آپ نے دن بھر چکّی پیسی ہے، لیکن اپنے جماؤ میں گھنٹوں کام کرتے رہیں ذرا تھکن نہیں ہوگی۔ لندن اور پیرس میں اشاروں سے زیادہ نہ لکھ سکا۔ حکیم صاحب تو دن بھر کی رُوداد اور تاثرات بھی سونے سے پہلے لکھ ڈالتے ہیں۔ رات کو اگر بہت ہی دیر ہو جائے تو صبح اُٹھ کر نماز کے بعد بھی کام کرتے ہیں۔ ان کی صبح بھی بہت جلدی ہوتی ہے۔ سوتے بھی بہت کم ہیں، اسی لیے کھوتے بھی کم ہیں بلکہ کھوتے ہی نہیں۔ اس بار حکیم صاحب نے ڈائری نہیں لکھی۔ انھوں نے سوچا کہ برکاتی بھی تو کچھ کام کرے، لیکن ہم ٹھیرے مسٹر موڈی۔

ایک دن پہلے پندرہ پونڈ دے کر ٹورسٹ بس میں سیٹ بُک کرا آیا تھا۔ صبح ہی اُٹھا۔ جلدی جلدی تیاری کی۔ ناشتا کیا۔ بیگم نقوی بڑے اصرار سے ناشتا کراتی ہیں۔ حکیم صاحب پر تو

کسی کا بس نہیں چلتا۔ وہ جب ناشتے یا کھانے کا ناغہ کرنا چاہیں تو انھیں کوئی رزق کا کیرا بھی منھ میں ڈالنے پر مجبور نہیں کر سکتا۔ اسی طرح جب پیٹ بھر جائے تو بلکہ اس سے پہلے ہی ہاتھ روک لیتے ہیں۔ اس کے بعد کسی کا کتنا ہی اصرار ہو وہ ہتھیار نہیں ڈالتے۔ یعنی دوبارہ کھانے پر ہاتھ نہیں ڈالتے۔ ان کا جواب ہمیشہ یہی ہوتا ہے:

"بس میرا کام ہو گیا۔"

میں تو اپنی طرف سے کم نہیں کھاتا، لیکن اکثر میزبان یہی کہتے ہیں کہ تم بہت کم کھاتے ہو، تو خیال ہوتا ہے شاید میری خوراک معمول سے کچھ کم ہو۔ نقوی صاحب بھی یہی کہتے تھے کہ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ آپ تو بھوکے رہتے ہیں۔ بہرحال ناشتا کر کے حکیم صاحب سے ان کا کیمرا لیا۔ اُس وقت تک میں نے کیمرا نہیں خریدا تھا۔ ٹوٹنگ بیک ٹیوب اسٹیشن نقوی صاحب کے گھر (ڈربک فیلڈ روڈ) سے بہت قریب ہے۔ پیدل وہاں پہنچا۔ زیرِ زمین جانے کے لیے خودکار زینے پر پہلی بار قدم جماتے ہوئے جھجک ہوتی ہے، لیکن ایک بار آدمی قدم اُٹھالے تو پھر خود بہ خود چلنے لگتا ہے۔ سوچا جائے تو زندگی کے ہر معاملے میں یہی ہوتا ہے۔ عمل شروع کرنے سے پہلے آدمی ڈرتا جھجکتا ہے، لیکن پہلا قدم اُٹھ جائے تو عام طور پر منزل تک پہنچ ہی جاتا ہے۔ میں بھی دو گاڑیاں بدلتا ہوا وکٹوریا اسٹیشن پہنچ ہی گیا۔ ایک بار زیرِ زمین ریلوے ٹیوب میں ایک بڑے میاں سے احتیاطاً پوچھا تھا کہ وکٹوریا کے لیے کس اسٹیشن سے گاڑی بدلنی ہو گی؟ بڑے میاں کے ساتھ بڑی بی بھی ہمدردی کرنے لگیں اور بولیں کہ ہم بھی اُسی اسٹیشن پر اُتریں گے اور تمھیں بتا دیں گے۔ اس اسٹیشن (غالباً اسٹاک ویل) پر اُتر کر اس بزرگ جوڑے نے مجھے اُس پلیٹ فارم پر پہنچایا اور یہ بھی بتایا کہ اس سمت سے گاڑی آئے گی اُس میں بیٹھ جانا۔ اس کے بعد مطمئن ہو کر وہ میرے شکریے کا شکریہ ادا کرتے ہوئے اپنے پلیٹ فارم کی طرف روانہ ہو گئے۔ کتنے شائستہ لوگ ہیں۔ خضرِ راہ ثابت ہوتے ہیں۔

ٹیوب کے کسی اسٹیشن پر گاڑی کے انتظار میں کھڑے ہو تو سامنے اندھیرا کالا غار نظر آتا ہے اور ذرا سی دیر کے لیے وحشت ہوتی ہے کہ اس گھور اندھیرے میں کیسے جائیں گے، لیکن ایک بار بیٹھ جاؤ تو گاڑی کا اُجالا ٹیوب کے اندھیرے پر غالب آجاتا ہے۔ ٹیوب سے لندن کے لاکھوں لوگ ہر وقت سفر کرتے ہیں۔ صبح و شام ہر ڈبا کھچا کھچ بھرا ہوتا ہے۔ لوگ کھڑے

ہوتے ہیں۔ کھوے سے کھوا چھلتا ہے۔ ٹیوب سستی اور تیز سواری ہے۔ منٹوں میں اس سرے سے اُس سرے تک پہنچا دیتی ہے۔ چالیس پنس سے لے کر ایک پونڈ تک ٹکٹ ہوتا ہے۔ کھڑکی پر آدمی کے علاوہ مشینیں بھی ٹکٹ دیتی ہیں۔ بڑے اسٹیشنوں پر تو بیس بیس مشینیں رکھی ہیں۔ ان پر اسٹیشنوں کے نام اور کرایہ لکھا ہے۔ سکّے مشین میں ڈالیے ٹکٹ نکل آئے گا۔ اس کے باوجود بعض وقت ٹکٹ خریدنے والوں کی لمبی قطار بن لگی ہوتی ہیں۔

وکٹوریا اسٹیشن پر اُتر کر ٹورسٹ بس کے اڈّے پر پہنچا اور ٹھیک نو بجے بس روانہ ہوئی۔ گائڈ ایک خاتون تھی۔ اس نے مائیک پر شہر کا تعارف کرانا شروع کیا۔ بازاروں کے نام اور خصوصیات کے ساتھ خاص خاص جگہوں کی تفصیل بھی بتاتی جاتی تھی۔

راستے میں ہائڈ پارک آیا۔ یہ بہت بڑا پارک ہے بلکہ پارکوں کا مجموعہ کہنا چاہیے۔ اس میں ایک کونا بھڑاس نکالنے کے لیے ہے۔ اس گوشے میں جو چاہے جو کچھ کہے کوئی روکنے ٹوکنے والا نہیں ہوتا۔ سیاست داں اور اشتہار باز، مصلح اور مجنون سب ہی یہاں آکر مجمع لگا سکتے ہیں اور لگاتے ہیں۔ سننے والے بھی ہر ایک کو کچھ نہ کچھ مل ہی جاتے ہیں۔ اس سے ایک بڑا فائدہ یہ ہے کہ گھٹن کی وجہ سے قومی زندگی میں جو فساد پیدا ہوتا ہے وہ نہیں ہونے پایا۔ انسان کی فطرت ہے کہ اگر وہ اپنے اصلی خیالات اور جذبات کو ظاہر نہ کر پائے تو وہ اندر ہی اندر پھوڑے کی صورت اختیار کر لیتے ہیں اور اچھا خاصا صحت مند انسان بیمار ہو جاتا ہے۔ ہائڈ پارک کی آزاد فضا میں دلوں کی بھڑاس نکلتی رہتی ہے۔ میں نے بس میں سے گزرتے ہوئے اس گوشے میں ایک آدمی کو تقریر کرتے ہوئے دیکھا۔ نہ بس رُکی نہ ہم اُتر سکے۔ میرے خیال میں کراچی میں بھی ایک ایسا پارک ہونا چاہیے جہاں ہر خیال کے اظہار کی پوری آزادی ہو۔ شاید اس طرح ہم تھوڑی دیر کے لیے آزادی کی فضا میں سانس لے سکیں۔ اس طرح ہمارے لیڈروں کی تربیت بھی ہو سکے گی۔ ویسے تو پورے انگلستان میں ہی آزادی ہے اور خوب آزادی ہے۔ وہاں ہر خیال کے لوگ بستے ہیں اور پناہ لیتے ہیں، لیکن ہائڈ پارک میں تو بالکل ہی آزادی ہے اور وہاں جو کچھ بھی کہا جائے اس کی بنیاد پر کوئی سزا نہیں دی جاتی۔ ہم اگر پورے ملک میں نہیں تو ایک "آزاد باغ" بنا کر اس میں تو تھوڑی سی ڈھیل دے سکتے ہیں۔ ذہنی ترقی کے لیے آزادی بہت ضروری ہے۔ قوم اسی وقت آگے بڑھتی ہے جب تمام اچھے

قصرِ بکنگھم

اچھے دماغوں سے کام لیا جائے اور ملک و قوم کے فائدے کی باتیں سوچنے اور کہنے کی پوری آزادی ہو۔

تھوڑی دیر میں ہم قصرِ بکنگھم کے قریب تھے۔ یہاں بادشاہ یا ملکہ رہتی ہیں۔ انگلستان کے لوگ بادشاہ (یا ملکہ) کو بہت چاہتے ہیں، لیکن بادشاہت کو نہیں مانتے۔ یعنی وہ اپنے بادشاہ یا ملکہ کا احترام تو بہت کرتے ہیں، لیکن حکومت جمہوری انداز کی پسند کرتے ہیں اور وزیرِ اعظم اور دوسرے وزیروں کو اپنی مرضی سے چُنتے ہیں۔ اگر وزیرِ اعظم ان کی نظر میں صحیح کام نہیں کرتا تو اس کو ہٹا دیتے ہیں۔ بادشاہ یا ملکہ حکومت کے کاموں میں دخل نہیں دیتی بلکہ عوام کے نمائندے جو چاہتے ہیں اور جو قانون بنا دیتے ہیں اُن کی منظوری دے دیتے ہیں۔

قصرِ بکنگھم کے سامنے اکثر بھیڑ رہتی ہے۔ دراصل لوگ شاہی محل سے زیادہ خود شاہ یا ملکہ کو دیکھنے کی آرزو میں وہاں جاتے اور کھڑے رہتے ہیں۔ پہرہ سخت ہے۔ چہار دیواری

خاصی مضبوط اور فولادی قسم کی ہے، لیکن پھر بھی پچھلے سال اخبارات میں آیا تھا کہ ایک دیوانہ
محل میں گھس ہی گیا تھا۔ ہماری بس میں ایک ضعیف اور معذور خاتون بھی تھی۔ محل کو دیکھنے

پہرہ بدلنے کا منظر

کے لیے وہ بھی اُتری۔ اس کی پہیتوں والی کرسی کو اس کی ساتھ والی دھکیلتی ہوئی لے گئی۔ میں نے اس کو ہانپتے ہوئے دیکھا تو کچھ دُور کرسی کو دھکیلنے میں مدد کی۔ بڑھاپے کے باوجود اس خاتون کا سیاحت اور مشاہدے کا شوق مجھے اچھا لگا، لیکن سیر و سیاحت کا مزہ جوانی ہی میں ہے۔ جوانی میں سفر سے آدمی بہت کچھ سیکھتا ہے اور وہ آیندہ زندگی میں اس کے کام آتا ہے۔

قصرِ بکنگھم مجھے تو کچھ زیادہ اچھا نہیں۔ صاف ستھرا، کشادہ، بڑی اور پھیلی ہوئی عمارت تو ہے، لیکن شان و شوکت نظر نہیں آتی۔ جب ملکہ محل میں مقیم ہوتی ہیں تو اس پر شاہی جھنڈا لہراتا رہتا ہے اور روزانہ پہرہ بدلتا ہے۔ پہرہ بدلنا (CHANGING OF THE GUARD) بھی دیکھنے کے قابل سمجھا جاتا ہے، میں نے بھی دیکھا۔ روزانہ صبح ساڑھے دس بجے یہ پہرہ

ویسٹ منسٹر ایبے ـــــ بیرونی منظر

بدلی کا مظاہرہ ہوتا ہے، مگر مجھے یہ ایک بے جان سی رسم معلوم ہوئی۔ جس میں سپاہیوں اور محافظوں کی مشق تو شامل تھی، لیکن شاید جذبہ شامل نہیں تھا۔ بہرحال دیکھا اور تصویر بھی لی۔

اسی ٹور میں ویسٹ منسٹر ایبے (WESTMINSTER ABBEY) بھی دیکھا۔ یہ

ویسٹ منسٹر ایبے ۔ ایک اندرونی منظر

بڑی تاریخی خانقاہ ہے۔ قبرستان بھی ہے اور شاہوں کی تاج پوشی کی جگہ بھی۔ یوں تو اس کی تاریخ بہت پرانی ہے، لیکن کہتے ہیں کہ اس کو ایڈورڈ دی کنفیسر نے گیارھویں صدی عیسوی میں بنایا تھا۔ اٹھارویں صدی تک اس میں اضافے ہوتے رہے۔ (اس کے ہجے منسٹر بمعنی وزیر (MINISTER) سے مختلف ہے۔ اس میں آئی نہیں ہے، یہ (MNISTER) ہے۔) ویسٹ منسٹر کسی زمانے میں دریائے ٹیمز میں ایک جزیرہ تھا۔ ایڈورڈ دی کنفیسر کے زمانے سے اب تک ہر انگریز بادشاہ کی تاج پوشی اسی عمارت میں ہوئی ہے۔ اس وسیع اور بلند عمارت کا حُسن دیکھنے سے تعلق رکھتا ہے۔ اندر سے سجاوٹ، حُسن کاری اور رکھ رکھاؤ میں بہت کم عمارتیں شاید اس کا مقابلہ کر سکیں۔ اس میں بڑے بڑے لوگوں کی قبریں بھی ہیں، جن میں صرف بادشاہ اور جنگی سورماؤں کے علاوہ بڑے بڑے شاعر و ادیب اور سائنس داں بھی شامل ہیں۔ انگریزی نظم کا باوا آدم چاسر، مشہور سائنس داں چارلس ڈارون، عظیم ادیب چارلس ڈکنس، سیموئل جانسن یہیں دفن ہیں۔ "گُم نام جنگ جُو" کی قبر بھی یہیں ہے جو فرانس سے پہلی جنگِ عظیم کے بعد نومبر ۱۹۲۰ء میں یہاں لایا گیا اور شاہوں کے درمیان دفن کیا گیا۔

اس خانقاہ (ایبے) میں کئی گرجائیں ہیں۔ عیسائی عبادت گاہوں کی کئی قسمیں ہیں۔ چرچ جس کو ہم گرجا کہتے ہیں۔ چیپل (CHAPEL) اُس جگہ کو کہتے ہیں جو کسی اسکول، قید خانے یا کسی گھر میں عبادت کے لیے استعمال ہو۔ کیتھڈرل (CATHEDRAL) اس بڑے چرچ کو کہتے ہیں جس میں اُسقُف یا بِشَپ (بڑے پادری) کا تخت ہوتا ہے۔ ایبے (ABBEY) ایک خانقاہ قسم کی چیز ہوتی ہے۔ اس میں راہبوں اور راہبات (NUNS) کا قیام بھی ہوتا ہے۔ ان کا حاکم صدر راہب یا صدر راہبہ ہوتی ہے۔ ایبے میں گرجا یا گرجے، اسکول، دفتر وغیرہ یعنی اجتماعی زندگی کی اکثر ضرورت کی چیزیں ہوتی ہیں۔

۱۳

تفریحی بس والوں نے دن بھر تاریخی اور اہم مقامات کی سیر کرانے کے علاوہ لنچ کا بھی ذمّہ لیا تھا اور جو پندرہ پاؤنڈ وصول کیے تھے اُس میں کھانے کی قیمت بھی شامل تھی۔ ایک اچھے سے بازار میں انھوں نے بس روکی۔ سب کو ایک صاف ستھرے ریسٹوران میں لے گئے۔ کھانا اچھا تھا۔ میری میز پر دو امریکی عورتیں بھی بیٹھی تھیں۔ خاصی عمر رسیدہ تھیں۔ لندن کی سیر کرنے ہی آئی تھیں۔ لندن کی تعریف کر رہی تھیں۔ میں نے پوچھا کہ کیا لندن امریکا سے اچھا ہے؟ فوراً بولیں کہ نہیں، امریکا کا مقابلہ تو نہیں کر سکتا۔ اور یہ واقعہ ہے کہ امریکا بہت ترقی یافتہ ہے۔ وہاں مشینوں کا زیادہ رواج ہے۔ بہت سے کام خود کار مشینوں سے ہو جاتے ہیں۔ دولت بہت ہے۔ عمارتیں بہت اونچی اونچی ہیں۔ پہلے ۱۰۲ منزلہ اسٹیٹ امپائر بلڈنگ سب سے اونچی شمار ہوتی تھی۔ اب اس سے بھی بلند عمارتیں بن گئی ہیں۔ انگلستان اور فرانس میں بہت زیادہ اونچی عمارتیں جن کو فلک بوس کہا جا سکے نہیں ہیں۔ ان ملکوں کے رہنے والوں نے غالباً کوشش کر کے بے تحاشا بلندی سے اپنے شہروں کو بچایا ہے۔

نیویارک اور لندن میں بہ قول محترم ڈاکٹر حافظ محمد الیاس صاحب وہی فرق ہے جو کراچی اور حیدرآباد میں ہے، یعنی کسی نیویارک والے کو لندن ایسا ہی معلوم ہوتا ہے جیسا کراچی والوں کو حیدرآباد سندھ۔ البتہ لندن کی ٹیوب کی برابری مشکل ہی سے ہو سکتی ہے۔

ریسٹوران سے نکل کر پھر بسوں میں بیٹھ گئے۔ گائڈ خاتون نے مائک سنبھالا اور اپنا سبق دُہرانا شروع کر دیا۔

بازاروں میں دُکانوں پر خاصا ہجوم ہوتا ہے، لیکن ہجوم بھیڑ میں نہیں بدلتا، کیوں کہ انگریز قطار بنانے کی ”خراب“ عادت میں مبتلا ہیں۔ بھلا یہ بھی کوئی بات ہوئی کہ جہاں دو

آدمی ہوئے اور انھوں نے قطار بنائی۔ ہماری تو یہ عادت ہے کہ اگر کہیں قطار لگی ہو تو سوچتے ہیں کہ اس قطار سے کیسے پیچھا چھڑائیں۔ کوئی جاننے والا مل جائے تو چپکے سے اس کی مدد لے لیں۔ جاننے والا نہ بھی ملے تو قطار کے اگلے حصّے میں کسی کو پیسے پکڑا دیں کہ میاں، تم ہمارے لیے بھی ٹکٹ لے لینا۔ اور جب تک وہ فارغ ہو کر ہمیں ٹکٹ یا پیسے نہ تھما دے ہمارے دل میں دُھکڑ پکڑ ہوتی رہتی ہے کہ کہیں میاں پیسے لے کر رفوچکّر نہ ہو جائے، لیکن قطار میں لگنے کی توہین اور مصیبت سے بچنے کے لیے یہ کوفت برداشت کرتے ہیں۔ تفریحی بس میں سے گزرتے ہوئے کہیں کہیں قطاریں نظر آئیں تو خیال ہوا کہ ہمیں تو صف بندی کی خصوصی تعلیم دی گئی ہے اور نماز میں ٹیڑھی صف بھی ناپسندیدہ ہے، مگر پھر بھی بہ قول اقبال:

صفیں کج، دِل پریشاں، سجدہ بے ذوق

عید کی نماز میں ہماری آڑی ترچھی صف بندی دیکھنے کے قابل ہوتی ہے۔ کعبہ کدھر ہوتا ہے اور نمازیوں کا منہ کدھر۔ پھر نماز کے بعد انھی پریشان صفوں میں مسجد کا "انتظام" کرنے والے جھولی بلکہ جھولا پھیلائے خُطبہ سُننا حرام کر دیتے ہیں۔ ایک یہ "بددین" انگریز ہیں کہ قطار بندی کے اصول کو دین و ایمان سمجھتے ہیں۔ دِل چاہا چیخ کر پوچھوں "اے بے ایمانو! تم اتنے اصول پسند کیوں ہو!"

بس میں ایک نوجوان پر نظر پڑی تو خیال ہوا کہ اگر یہ پاکستانی نہیں تو مسلمان ضرور ہے۔ وہ بھی اکیلا تھا۔ میں نے پوچھ ہی لیا۔ کہنے لگا کہ میں دوہا، قطر کا ہوں۔ میرا نام عمر سَقّا ہے۔ پھر خود ہی سَقّا کے معنی سمجھانے لگا۔ میں نے کہا کہ ہم سَقّوں کو خوب جانتے ہیں۔ اب تو بڑے شہروں میں سَقّے کیا اُن کا نام بھی سُننے میں نہیں آتا، لیکن بچپن میں جب نلوں کا جال نہیں پھیلا تھا، سَقّے ہی گھروں میں پانی لایا کرتے تھے۔ کنویں سے پانی بھر کر بیل پر پکھال میں بھرتے، جب پکھال پوری بھر جاتی تو بیل کو ہانکتے ہوئے گھروں کے باہر لا کر کھڑا کر دیتے اور پھر پکھال سے مشکیں بھر بھر کر اندر پہنچاتے۔ سَقّے کو بہشتی بھی کہتے تھے، کیوں کہ وہ پانی پہنچاتا تھا۔ یہ اور بات ہے کہ عورتیں بہشتی کو بھشتی کہتی تھیں۔ گرمیوں میں سَقّے کا انتظار بڑی بے چینی سے کیا جاتا تھا۔

ایک زمانے میں "بچہ سقّا" بھی بہت مشہور ہوا تھا۔ یہ دراصل ایک ڈاکو کا نام تھا جس نے ۱۹۲۹ء میں افغانستان میں بدامنی سے فائدہ اُٹھا کر کابل پر قبضہ کر لیا تھا اور حاکم بن بیٹھا تھا۔ بہرحال عمر سقّا نے بھی پاکستان کا نام سُن رکھا تھا اور وہ پاکستان ہی میں شادی کرنا چاہتا تھا۔ میں نے پوچھا کہ پاکستانی لڑکیاں ہی تمھیں کیوں پسند ہیں؟ تو اُس نے کہا کہ وہ مُسلم ہوتی ہیں۔ بھلا یہ بھی کوئی بات ہوئی۔ کیا پاکستان کے علاوہ کہیں اور مسلمان نہیں ہوتے۔ بہرحال سقّا صاحب تفریح کے لیے گھوم رہے تھے۔ ایک اچھا سا کیمرا اُن کے پاس تھا۔ انھوں نے میری بھی تصویریں کھینچیں۔ ٹاور اوف لندن سے واپسی پر مجھے چائے بھی پلائی۔ اپنا پتا دیا، میرا پتا لیا۔ انگریزی کم جانتے تھے۔ مشکل سے مطلب ادا کرتے تھے۔

تفریحی بس ٹاوَر اوف لندن بھی گئی۔ نام سے معلوم ہوتا تھا کہ یہ بھی کوئی مینار یا بگ بین قسم کا کوئی گھنٹا گھر ہو گا، لیکن یہ کئی ٹاوروں کا مجموعہ ہے۔ دریائے ٹیمز کے کنارے یہ تاریخی عمارت بلکہ عمارتیں ہیں۔ نو سو سال سے زیادہ پرانی بتائی جاتی ہیں۔ ان کو دیکھ کر ہی ان کے پرانے پن یا قدامت کا اندازہ ہو جاتا ہے، مگر انگریز حفاظت کرنا خوب جانتے ہیں۔ خود بھی بڑے قدامت پسند ہیں۔ اِن کی جِدّت میں بھی قدامت ہے۔ وہ اپنی ہر چیز کو خاص طور پر تاریخ اور تہذیب سے متعلق چیزوں کو اپنی جان سے زیادہ عزیز رکھتے ہیں۔ انھوں نے جمہوریت اپنا لی اور دل سے اپنا لی کہ ایسی آزادی اور جمہوریت

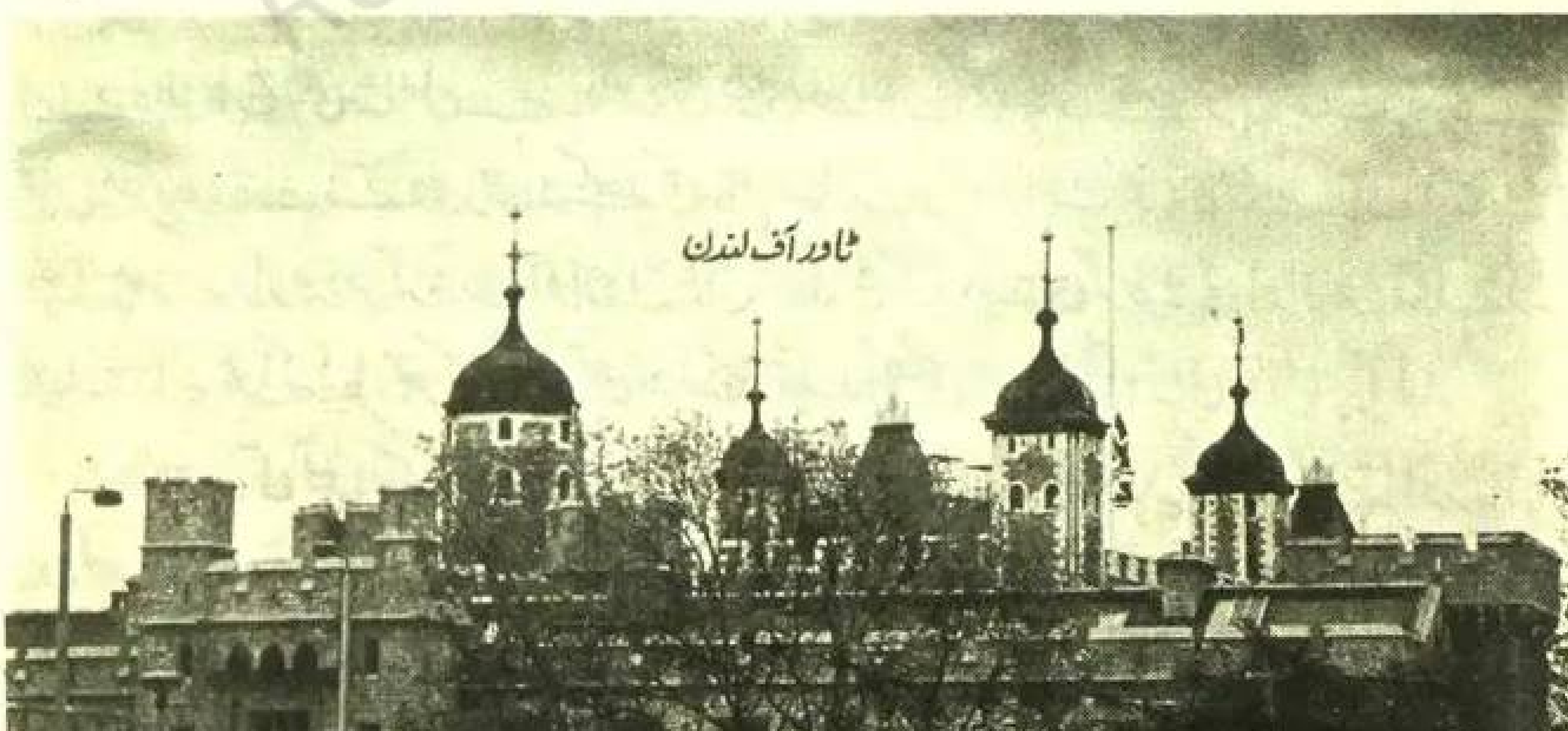

ٹاور آف لندن

شاید ہی کہیں ہو، لیکن بادشاہت کا نام بھی باقی رکھا ہے۔ حکومت تو عوام کی ہوتی ہے مگر سکہ بادشاہ یا ملکہ کا چلتا ہے۔

ٹاور اوف لندن ابتدا میں چھوٹا تھا اور لکڑی کا مینار بنا ہوا تھا۔ پھر پتھروں کا وہ بڑا مینار بنایا گیا جو وہائٹ ٹاور کہلاتا ہے۔ دراصل یہ قلعہ ہے۔ تاریخ کا یہ دل چسپ سبق ہے کہ قلعہ شاہوں کا گھر بھی ہوتا ہے اور قید خانہ بھی۔ گویا قلعوں میں تخت اور تختہ دونوں ہی سما سکتے ہیں۔ یہ وقت وقت کی بات ہوتی ہے کہ قلعے میں کون کس حیثیت سے جاتا ہے اور رہتا ہے۔ خیر ہم غریب تو مسافر کی حیثیت سے دیکھنے گئے تھے۔ یہ ہمارے لیے نہ محل تھا اور نہ قید خانہ۔ گائڈ خاتون نے بس میں اُترنے سے پہلے مذاق سے کہا کہ ٹاور اوف لندن میں داخلے سے پہلے تلاشی لی جاتی ہے۔ اس لیے آپ لوگ اپنے اپنے بم یہیں بس میں چھوڑ جائیں۔ ٹکٹ بھی اسی نے خرید کر سب کو تقسیم کر دیے تھے۔ عمارتیں دیکھ کر بڑی عبرت ہوئی۔ ان عمارتوں نے انگلستان کی تاریخ میں اہم حصّہ لیا ہے۔ کہتے ہیں کہ ولیم دی کونکرر (فاتح ولیم) نے قلعے کے لیے اس جگہ کا انتخاب کیا تھا۔ عمارتوں کی تعمیر میں بیس سال سے زیادہ کا عرصہ لگا، پھر مختلف بادشاہ اس کی حفاظتی تعمیروں میں اضافے کرتے گئے۔ بہت سے بادشاہوں کا یہ محل رہا اور بہت سوں کا قید خانہ۔ یہاں کے قیدی بھی تاریخ کے مشہور نام ہیں۔ آج کل اس کے ایک حصّے ویک فیلڈ ٹاور میں جواہرات اور شاہی نادر چیزوں کا "جواہر خانہ" ہے، جس میں ہتھیار بھی شامل ہیں۔ یہیں تاج بھی رکھے ہیں جن میں کوہِ نور ہیرے والا تاج بھی شامل ہے۔ اس کی بڑی حفاظت کی جاتی ہے۔ زبردست پہرہ ہے، لیکن مقررہ وقت کے دوران دیکھنے کی عام اجازت ہے۔ البتہ اس کا ٹکٹ الگ لینا پڑتا ہے۔ پہرے دار برابر کرخت آوازوں میں "جلدی کرو، جلدی کرو" کی آوازیں لگاتے رہتے ہیں۔ نتیجہ یہ ہوا کہ نظر بھر کر دیکھ بھی نہ سکا۔ ایک اُچٹتی ہوئی نگاہ ڈالی اور باہر آ گیا۔

سیّاحوں کی بس کے آخری اسٹاپ پر اُترنے کے بجائے میں درمیان میں اُتر پڑا اور بازار میں گھومنے لگا۔ منزل اور سمت متعین کر کے چلنا چاہیے اور عام طور پر یہی کیا جاتا ہے، لیکن کبھی کبھی اور کچھ دیر کے لیے آدمی بے سمت ہو جائے تو بڑا مزہ آتا ہے۔ اس طرح اسے شاید آزادی کا احساس ہوتا ہے۔ یوں تو آدمی ہر وقت ہر جگہ پابندیوں میں جکڑا رہتا ہے، لیکن کبھی کبھی اُسے

BEDAR COLLECTION
Date 12.4.91 No 5371

موقع مل جائے اور وہ اپنے کو آزاد محسوس کرے تو اسے سکون محسوس ہوتا ہے۔ بس یونہی میں بھی نامعلوم راستوں پر چلنے لگا۔ کہیں کہیں رُکتا، کسی دُکان میں گھس جاتا، کہیں سے کچھ خرید لیتا۔ معلوم نہیں کن کن بازاروں سے گزرا۔ کن گلیوں میں مُڑا۔ کہاں کہاں ٹھٹکا۔ مجھے پیدل چلنے میں لُطف آرہا تھا، لیکن یہاں ایک خرابی ہے۔ بازار جلدی سے بند ہونے لگتے ہیں۔ چھے بجے سے ہی دُکانیں بڑھنے لگتی ہیں۔ سیاح کا دل تو یہ چاہتا ہے چوبیس گھنٹے شہر جاگتا رہے، لیکن شہر کے چوبیس گھنٹے جاگنے والے علاقے الگ ہوتے ہیں۔

میں نے ایک سپاہی سے پوچھا کہ یہ کون سا علاقہ ہے تو اس نے بتایا کہ "پکاڈلی سرکس"۔ میں نے اس سے ٹوٹنگ بیک پہنچنے کا طریقہ بھی پوچھا، اس نے ذرا بھی "پولیس پَن" نہیں جتایا۔ بلکہ بڑے اخلاق سے مجھے ٹیوب کے اسٹیشن اور بسوں کے نمبر بتانے لگا، لیکن مجھے شبہ ہونے لگا کہ میں بھٹکے بغیر نہ پہنچ سکوں گا۔ دوسرے ڈر لگنے لگا کہ دیر بہت ہو گئی اور حکیم صاحب فکرمند ہوں گے۔ لہٰذا میں نے سپاہی کا تو شکریہ ادا کیا اور خود ایک ٹیکسی کی جانب روانہ ہوا۔ لندن میں ٹیکسی میں آسٹن کاریں چلتی ہیں۔ ان کی وضع کچھ اس طرح کی ہے کہ پرانے زمانے کی موٹریں یاد آنے لگتی ہیں۔ اُس زمانے میں ایک آدمی کو انجن میں بڑی سی چابی لگا کر گھمانی پڑتی تھی، تب کہیں جا کر کار اسٹارٹ ہوتی تھی۔ بہرحال اپنے آپ کو ٹیکسی والے کے سپرد کر دیا۔ ڈریک فیلڈ روڈ کے قریب پہنچ کر اُتر گیا۔ چھے پاؤنڈ ٹیکسی والے کے نذر کیے۔ اُترنے کے بعد اندازہ ہوا کہ ذرا پہلے اُتر گیا، خیر نقوی صاحب کے گھر میں داخل ہوا تو حکیم صاحب نقوی صاحب سے کہہ رہے تھے کہ آج ہمارا "فلسفی" شاید راستہ بھول گیا۔ بہت دیر ہو گئی۔ میں نے سامنے جا کر کہا، السلام علیکم۔ حکیم صاحب اپنے مخصوص انداز میں بولے "اماں کہاں غائب ہو گئے تھے؟ یہ کیا حرکت ہے؟" حکیم صاحب نے ازراہِ محبّت میرے انتظار میں کھانا نہیں کھایا تھا۔ ہم سب فوراً کھانے پر ٹوٹ پڑے۔ سارے دن کی رُوداد سُن کر حکیم صاحب نے فرمایا کہ گائڈ خاتون کو کیا ٹپ دی؟ مجھے اب اپنی غائب دماغی کا احساس ہوا کہ اس بےچاری کو ایک دھیلا بھی نہیں دیا۔ حکیم صاحب نے فرمایا کہ میں بھی صبح یہ بتانا بھول گیا تھا کہ اس کو ایک پاؤنڈ دے دینا۔ بہرحال اب کیا ہوتا ہے، لیکن مجھے افسوس بہت ہوا، کیوں کہ اس نے بڑی محنت سے رہنمائی کے فرائض انجام دیے تھے۔

۱۴

جس دن یعنی ۲۹ اگست ۸۲ء کی رات کو ہم لندن پہنچے تھے، اُسی شام کو میں نے نقوی صاحب سے پوچھا کہ میں ذرا چہل قدمی کر آؤں ؟ تو انھوں نے کہا کہ ضرور سیدھے ہاتھ کو چلے جائیے۔ چند قدم کے فاصلے پر پارک ہے۔ نئی جگہ ہونے اور اکیلا ہونے کی وجہ سے ذرا آہستہ آہستہ چلا۔ نئے راستوں پر آدمی ذرا سنبھل کر ہی قدم اُٹھاتا ہے، اور یہ ہونا بھی چاہیے۔ جب آدمی چند بار کسی راستے سے گزر جائے تو پھر تیزی اور بے فکری سے چل سکتا ہے، پھر گُم راہی کا خطرہ نہیں ہوتا۔ پارک کے کنارے پہنچ کر رُک گیا۔ اندر داخل ہونے کی ضرورت محسوس نہیں ہوئی۔ پارک میں لوگ بیٹھے بھی تھے اور کھیل کُود بھی رہے تھے۔ کچھ پکّی عمر کے لوگ دوڑ بھی رہے تھے۔ ایک صاحبہ دوڑ میں کتّے سے مقابلہ کر رہی تھیں۔ اس ملک کے لوگ بھی خوب ہیں۔ جس وقت جو کام کرتے ہیں اتنے انہماک اور خلوص سے کرتے ہیں کہ اُس وقت دیکھنے سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ اس کے علاوہ یہ شاید زندگی میں کوئی اور کام ہی نہیں کرتے۔ سبزہ اور ہرے بھرے درخت، پھول پودے بھی کیسی نعمت ہیں۔ روح کو کیسا سُرور اور سکون بخشتے ہیں۔ اسی لیے تو ہم ان کی اتنے شوق سے آبیاری کرتے ہیں اور یورپ کے لوگ تو ان کو اپنے بچّوں کی طرح پالتے پوستے ہیں۔ بڑی ممتا کے ساتھ ان کی خدمت اور حفاظت کرتے ہیں۔ کیا مجال ہے کہ کوئی بچّہ کوئی پھول توڑے یا کسی پودے کو نقصان پہنچائے۔ ہماری طرح نہیں کہ ہم پارکوں اور باغوں کو خراب کر کے خوش ہوتے ہیں۔ خیر ابھی ہماری قوم بھی تو بچّی ہے، بڑی ہو گی تو ان شاء اللہ سمجھ آجائے گی۔

تھوڑی دیر پارک کے کنارے کھڑا تازہ ہوا میں سانس لیتا رہا۔ اندھیرا ہونے لگا، لیکن چاند بھی اپنا مکھڑا دکھانے لگا۔ میں نے سوچا کہ کیا یہ بھی وہی چاند ہے جس کو میں اپنے پاکستان میں دیکھا کرتا ہوں، ہاں یہ وہی چاند ہے، وہی آسمان ہے۔ صرف زمین وہ نہیں ہے۔ یہ زمین دوسروں کی ہے۔ میری زمین یہاں سے سات ہزار میل دُور ہے۔ جس طرح اس چاند کا نُور سب جگہ پہنچتا ہے اسی طرح محبّت اور پیار کی روشنی بھی سب جگہ پھیل جائے تو کتنا اچھا ہو۔ کتنا مزہ آئے اگر ساری دنیا کے لوگ دِلوں سے بُغض، حسد اور نفرت نکال دیں اور بھائی بھائی بن کر ایک دوسرے کی خوشیوں میں شریک ہوں اور اپنے علم اور اخلاق سے انسان کی بھلائی کے لیے

کام کریں۔ مجھے تو ایسا لگتا ہے کہ ہر قوم کے اور ہر طبقے کے لوگ محبّت کے بھوکے ہیں، لیکن اُن کے لیڈر اُن کو امن چین سے نہیں رہنے دیتے۔

چاند کو بار بار دیکھتا اور یہ تصور کرتا کہ اسی چاند کو پاکستان میں بھی دیکھا جا رہا ہوگا۔ اسی کی چاندنی میرے وطن پر بھی کھیت کر رہی ہوگی۔ سورج کی گرمی اور چاند کی ٹھنڈک سب کے لیے عام ہے۔ اسی طرح علم کی روشنی بھی سب کے لیے ہے۔ کوئی اس کو روکنا چاہتا ہے یا کوئی اپنی کھڑکیاں بند کر لیتا ہے کہ علم کی چاندنی کو اپنے گھر میں نہ آنے دے تو اس میں علم کا کیا قصور۔ آج ساری دنیا علم اور سائنس کے اُجالے سے جگمگا رہی ہے، کمی ہے تو محبّت کی۔ یہ کمی دُور ہو جائے تو دنیا امن و راحت کا گہوارہ بن جائے۔

صبح کو آنکھ کھلی تو معلوم ہوا کہ رات کو خاصی بارش ہوئی تھی۔ پردہ ہٹایا تو دروازے کے شیشوں میں سے صحن کی دُوب نظر آئی۔ جس پر شبنم کے موتیوں کے بجائے بارش کے ننھّے ننھّے قطرے سورج کی کرنوں سے چاندی کی طرح چمک رہے تھے۔ ایک حسین پرندہ درختوں سے نیچے اُتر کر سبزے کی تازگی سے لُطف اندوز ہو رہا تھا۔ گرگُٹیا کے سائز کی یہ چڑیا اپنے رنگا رنگ پروں کی وجہ سے باغ میں پھول کی طرح معلوم ہو رہی تھی۔ گرگچیا فاختہ کے سے رنگ اور پیلی چونچ کی ہوتی تھی اور گھروں میں اکثر آجایا کرتی تھی۔ اسی کو شاید گوشَل بھی کہا جاتا ہے۔ بچپن میں دیکھا ہے کہ گھروں میں اکثر اس قسم کے پرندے آ ٹپکتے تھے۔ اُس وقت شہر اور جنگل میں اتنا فاصلہ بھی نہیں ہوا تھا۔ شہر چھوٹے تھے اور قدرتی ماحول کی کچھ نہ کچھ جھلک شہروں میں بھی مِل جاتی تھی۔ زیادہ سے زیادہ چند میل چلو تو باڑیاں (چھوٹے چھوٹے کھیت) شروع ہو جاتی تھیں۔ گویا یہ شہر اور جنگل کے درمیان "بلفر زون" ہوتا تھا۔ ان باڑیوں میں سبزی ترکاری بوئی جاتی تھی۔ کنوؤں میں رہٹ لگے ہوتے اور ان سے پانی نالیوں میں ہوتا ہوا باڑیوں کو سیراب کرتا جاتا۔ شام کو سیر کے لیے ان باڑیوں میں جاتے۔ ہوا خوری اور چہل قدمی دونوں ہو جاتیں۔ ان باڑیوں میں بھی طرح طرح کی چڑیاں، کبوتر، فاختائیں، توتے، لال اور بدّیاں اِس پیڑ سے اُس پیڑ پر پھُدکتے اور چہچہاتے۔ فطرت کا حُسن انسان میں زندگی کی اُمنگ پیدا کرتا ہے۔ شہروں کے پھیلاؤ نے ہمیں اِس حُسن سے محروم کر دیا ہے۔ خیال آیا کہ ہمارے حکیم صاحب بھی اپنے شہر ثقافت کے لیے ایک بہت بڑی زمین کی تلاش میں ہیں جہاں لائبریری اور دوسرے اداروں کے علاوہ قلم کاروں اور عالموں کے رہنے اور کام کرنے کے لیے "خانقاہیں" بھی ہوں۔ اور یہ عمارتیں باغوں سے گھری ہوں۔ اس کے لیے حکیم صاحب کئی سو ایکڑ زمین خریدنا چاہتے ہیں۔ اس گلستانِ علم میں پھولوں پھلوں کی بہار اور علم کا نکھار یکجا ہو جائے تو حکیم صاحب کا خواب پورا

ہو جائے ۔ اس خواب کا نام "مدینتہ الحکمت" ہے ۔ خواب کو حقیقت میں بدلنے کے لیے دیوانگی کی ضرورت ہوتی ہے ۔ حکیم صاحب کا یہ دیوانہ پن ہی تو ہے کہ نئے نئے کارخانے بنانے اور دولت جمع کرنے کے بجائے علم کی بستی بسانا چاہ رہے ہیں ۔ ان کا اپنا گھر آج بھی وہی ہے جس میں کراچی آکر پہلے دن سر چھپایا تھا ۔ نئی نئی عالی شان بستیاں بس گئیں ۔ اس میں لوگوں کے محل کھڑے ہو گئے ، لیکن حکیم محمد سعید اپنے اس درمیانہ درجے کے مکان میں بیٹھے علمی عمارتوں کے منصوبے بنا رہے ہیں ۔ خدا کرے یہ زمین جلدی سے مل جائے اور حکیم صاحب کا حوصلہ اُن کے وسائل کو وسعت بخشے ۔ میں نے سوچا کہ عزم ہو تو کیا نہیں ہو سکتا ۔ اوکسفرڈ یونی ورسٹی بھی تو ہے اور کیمبرج یونی ورسٹی بھی تو ہے ۔ یہ بھی پورے پورے شہرِ علم ہیں ، لیکن یہ تو صدیوں میں اس منزل کو پہنچے ہیں اور ان کو پوری قوم نے بنایا اور یہ انگریز قوم کی زندگی ہیں ، لیکن ہم اپنی قوم سے کیوں مایوس ہوں ۔ حکیم صاحب نے مدینتہ الحکمت کی بنیاد ڈال دی تو یہ بستی بھی بستے بستے بس جائے گی ۔

لندن کے ہوائی اڈے ہیتھرو پر ہی ڈاکٹر ماہ ناز حسین اور ان کے شوہر شبیر حسین صاحب سے ملاقات ہو چکی تھی ۔ ڈاکٹر ماہ ناز حسین ، عزیزہ سعدیہ سلمہا (بیگم راشد منیر احمد) کی نند ہیں اور برسوں سے لندن میں مقیم ہیں ۔ اچھی معالج شمار ہوتی ہیں ۔ شبیر صاحب کسی بینک میں ہیں ۔ دونوں بہت پُر تپاک اور ہنس مکھ ہیں ۔ ایک دن وہ ہمیں اپنی گاڑی میں شہر گھمانے لے گئے ۔

سب سے پہلے لندن کے اسلامی مرکز گئے ۔ یہ شان دار اور وسیع و عریض عمارت ہے اور مسجد اور مسلمانوں کے مذہبی اور ثقافتی اجتماعات کا مرکز ہے ۔ اس کی موجودہ شکل جولائی ۱۹۷۷ء میں مکمل ہوئی ۔ اس کی ابتدا تو ۱۹۴۴ء میں ہوئی تھی جب مصر کے شاہ فاروق نے گرجا کے لیے قاہرہ میں زمین دی تھی ۔ اس کے جواب میں تاجِ برطانیہ نے ریجنٹس پارک کے کونے میں ایک عمارت برطانیہ کے مسلمانوں کے لیے دی تھی ، لیکن وہ نہ برطانیہ کے بیس لاکھ سے زیادہ مسلمانوں کے شایانِ شان تھی اور نہ کافی ۔ اس کو ۱۹۷۳ء میں مُنہدم کر دیا گیا تاکہ نئی اور بڑی عمارت بنائی جائے ۔

موجودہ وسیع و کشادہ دو منزلہ عمارت انگریزی کے (L) کی وضع میں ہے ۔ مسجد کا بڑا چوکور ہال اپنی ایک خاص شان رکھتا ہے ۔ مسجد کا گنبد اور مینار (۴۳ میٹر بلند) فنِ تعمیر کی جدید ترقیوں سے فائدہ اُٹھا کر بنایا گیا ہے ۔ اس مرکز کی تعمیر کے لیے ساری دنیا کے ماہرینِ تعمیر کو نقشہ بنانے کے مقابلے میں شریک ہونے کی دعوت دی گئی تھی ، جس کے جواب میں ۱۷ ملکوں سے ۵۲ نقشے موصول ہوئے تھے ،

لیکن نقشہ سر فریڈرک گبرڈ کا پسند کیا گیا۔ اس مرکز کی تکمیل میں ۸ کروڑ روپے سے زیادہ خرچ ہوئے۔ آدھے سے زیادہ خرچا سعودی عرب نے دیا، باقی دوسرے عرب ملکوں اور بعض غریب ملکوں اور لوگوں نے پورا کیا۔

مرکزِ اسلامی میں مسجد کے علاوہ ایک کانفرنس ہال، دفتر اور کیفے ٹیریا بھی ہے۔ زیرِ زمین گاڑیاں کھڑی کرنے کی جگہ ہے جس میں پچاس سے زیادہ کاریں کھڑی کی جاسکتی ہیں۔ مرکز کے ڈائرکٹروں اور امام صاحبان کے رہنے کے لیے ۲ آرام دہ فلیٹ بھی بنائے گئے ہیں۔ بڑے ہال میں مسلمانوں کی شادی بیاہ اور دوسری تقریبات وغیرہ ہوتی ہیں۔ ہم جب ہال میں داخل ہوئے تو کوئی تقریب تھی۔ آدمی تو بہت زیادہ نہیں تھے، لیکن فرش پر پانی گرا ہوا تھا، کچھ برتن بھی میزوں پر اُلٹے پڑے تھے۔ سلیقے اور صفائی کا وہ معیار نہیں تھا جو لندن میں عام ہے اور آسانی سے اندازہ لگایا جاسکتا تھا کہ یہ مسلمانوں کا مرکز ہے۔ یہ سُن کر خوشی ہوئی کہ یہ ہر فرقے کے مسلمانوں کے کام آتا ہے اور یہاں کسی ایک فرقے کا قبضہ نہیں ہے۔ راجا صاحب محمود آباد جیسے قومی رہنما بھی اس کے نگراں رہ چکے ہیں۔

مسجد کے کشادہ ہال کا فرش الجیریا کے سنگِ مرمر کا بنا ہوا ہے۔ قالین ایران کا عطیہ ہے۔ مجھے یہ حیرت ہوئی کہ اتنا بڑا قالین جس میں بہ ظاہر کوئی جوڑ نظر نہیں آتا کس طرح لایا گیا ہوگا۔ یا پھر مختلف ٹکڑوں کو اس باریکی سے جوڑا گیا ہے کہ وہ بالکل ایک جان ہو گئے ہیں۔ شیشے کا ڈھائی ٹن وزنی جھاڑ اُردن کا عطیہ ہے۔ مسجد کے ہال کے باہر جوتے اُتارنے اور سامان رکھنے کی جگہ کے علاوہ وضو اور غسل کرنے کے لیے بڑا اچھا انتظام ہے۔

عمارت کا ایک حصّہ مُردوں کو غُسل دینے اور کفنانے کے لیے بھی ہے۔ نیز جو لوگ اپنے عزیزوں کی لاشوں کو اپنے مُلک لے جاکر دفنانا چاہتے ہیں تو اس کی تجہیز و تکفین کا بھی انتظام ہے۔

پہلی منزل پر دار المطالعہ اور لائبریری ہے۔ ہم پہنچے تو لائبریری کا ایک حصّہ مرمت کے لیے بند تھا۔ لائبریری میں میرا خیال ہے کہ کوئی ایک لاکھ کتابوں کی تو گنجائش ہوگی۔ دار المطالعے میں مختلف ملکوں کے رسالے اور اخبارات رکھے تھے۔ حکیم صاحب نے کہا کہ پاکستان واپس پہنچ کر "ہمدرد اسلامیکس" (انگریزی میں سہ ماہی اسلامی رسالہ جو حکیم صاحب کی ادارت میں شائع ہوتا ہے) اس لائبریری کے لیے جاری کردیجیے گا۔ اسلامی مرکز کی لائبریری والی منزل پر ہی ایک بُک اسٹال بھی ہے وہاں اسلامی کتابوں کے علاوہ کچھ طغرے اور وصلیاں بھی تھیں۔ بعض نئے قسم کے کاغذ یا پلاسٹک کے طغروں پر روپہلی زمین پر سبز حروف میں "اللہ" اور "محمدؐ" لکھا ہوا تھا۔ حکیم صاحب نے مشورہ دیا کہ تحفے میں دینے کے لیے کچھ خرید لو۔ میں نے چار طغرے پسند کیے، مگر لندن پہنچنے کے بعد پہلا دن تھا، میں نے ابھی اپنے ڈالر بدلوا کر پاؤنڈ بھی نہیں بنوائے تھے۔ اسٹال والوں سے کہا تو وہ ایک پونڈ کے بجائے دو امریکی ڈالر لینے کو تیار ہو گئے۔ چناں چہ ۶ ڈالر دے کر چار طغرے خرید لیے۔

۱۵

مرکزِ اسلامی سے نکل کر بگ بن دیکھتے ہوئے ہم مادام تُساد کی نمائش گئے جہاں دنیا بھر کی مشہور تاریخی اور موجودہ شخصیتیں موم کی مورتیں بنی کھڑی ہیں۔ ان کی ہر ادا سے زندگی ٹپکتی ہے۔ یہ وہ شخصیتیں ہیں جنھوں نے سیاست، سائنس، ادب یا کسی اور میدان میں انسانوں کی خدمت کی ہے۔ یہ اسی خدمت کی بنا پر اب بھی لوگوں کے دلوں میں زندہ ہیں۔ کتابوں میں ان کا ذکر ہے اور یہاں یہ پتھر کے بجائے موم کے لباس میں اس طرح محفوظ ہیں کہ معلوم ہوتا ہے کہ اب منہ سے بولنے والی ہیں۔ جس طرح مجسمہ ساز پتھر کو تراش تراش کر اُن میں سے انسانوں کی شکل و صورت نکال لیتے ہیں اسی طرح مادام تُساد نے موم کو مَل مَل کر یہ مورتیں پیدا کی ہیں۔ اس میں کمال موم کا نہیں بلکہ مادام تُساد کے ذہن اور ماہر ہاتھوں کا ہے۔

پاکستان کی کوئی شخصیت وہاں نظر نہ آئی۔ گاندھی جی بھی تھے اور اندرا گاندھی بھی، لیکن اقبال تھے نہ قائدِاعظم۔ ان میں شاید مادام تُساد کے شاگردوں کو کوئی کشش نظر نہ آئی۔ کہتے ہیں کہ مورت بنانے والے شخصیات کے انتخاب میں شہرت اور بڑائی کے علاوہ چہرے کے نقش و نگار کو بھی فنی لحاظ سے دیکھتے ہیں۔ دوسرے الفاظ میں کسی کی ظاہری شخصیت بھی ان کو مورت بنانے پر راغب کرتی ہے۔ جس شخصیت کی مورت بنانی ہو اس کے متعلق بڑی معلومات اکٹھی کی جاتی ہیں۔ اگر وہ شخص گزر چکا ہو تو اس کی سوانح اور تصویریں دیکھی جاتی ہیں۔ زندہ لوگوں کے حالات اور اخباری تصویروں کے علاوہ مورت بنانے والے خود اُن کا انٹرویو لیتے اور تصویریں اُتارتے ہیں۔ اس کے ساتھ ہی اُن کا ناپ بھی لیتے ہیں۔ ناک نقشہ ملایا جاتا ہے۔ بالوں کا انداز اور لباس وغیرہ بھی نوٹ کیا جاتا ہے، لیکن ان سب سے بڑھ کر میرے خیال میں فن کار کی نگاہ ہوتی ہے۔ یہ نگاہ عام نگاہ سے مختلف ہوتی ہے۔ فن کار کی نگاہ اکثر اُس حُسن کو دیکھ لیتی ہے جس کو عام آدمی نہیں دیکھ سکتا۔

مادام میری تساد

زندہ لوگوں کی مورتیاں بعض وقت نمائش سے ہٹا بھی دی جاتی ہیں، کیوں کہ اُن کی شکل بدل جاتی ہے اور اصل و نقل کی مشابہت میں فرق آجاتا ہے۔

اس نمائش کی بانی مادام میری تُساد تھیں۔ یہ خاتون ۱۷۶۱ء میں پیدا ہوئیں۔ بچپن پیرس میں گزرا۔ ان کو ان کے چچا نے موم کی مورتیاں بنانا سکھائیں۔ شروع شروع میں یہ اپنی نمائش جگہ جگہ لیے پھریں، پھر ۱۸۳۵ء میں لندن میں جم گئیں۔ انھوں نے موم کی آخری مورتی خود اپنی بنائی۔ اُس وقت ان کی عمر ۸۱ سال تھی۔ اُن کی یہ مورتی بھی نمائش میں موجود ہے اور گویا نمائش دیکھنے والوں کا استقبال کرتی ہے۔ ۱۸۵۰ء میں ان کا انتقال ہوا، لیکن یہ نمائش ترقی ہی کرتی جا رہی ہے۔

انگریزوں کی خوبی یہ ہے کہ ان کا اپنا ادارہ جو ایک بار بن جائے وہ اس کو قائم رکھتے ہیں اور ترقی دیتے ہیں، یہاں تک کہ وہ ادارہ ایک تاریخ بن جاتا ہے۔ شاید اسی لیے اُن کو قدامت پسند اور روایت پرست کہا جاتا ہے۔

میں نے ایک بہت پرانا سفرنامہ "آئینۂ سکندری" پڑھا تھا۔ بابو اُما شنکر نے ۱۸۸۶ء میں یورپ کا سفر کیا تو یہ سفرنامہ لکھا۔ اُس زمانے کے لحاظ سے بڑا دل چسپ سفرنامہ ہے۔ اس میں انھوں نے مادام تُساد کی نمائش کا حال بھی لکھا ہے۔ انھوں نے لکھا ہے کہ جب ہم یہ نمائش دیکھنے گئے تو ایک بنگالی بابو بھی ہمارے ساتھ تھے۔ جب دروازے کے اندر گھُسے تو ایک سنتری کھڑا ہوا دکھائی دیا۔ بنگالی صاحب اس کو اصلی سنتری سمجھے اور اس سے کچھ پوچھنا چاہتے تھے کہ عورتیں

قہقہہ مار کر ہنسنے لگیں، تھوڑی دیر کے بعد بابو صاحب نے اپنی شرمندگی کا بدلا لینے کے لیے ایک دل چسپ شرارت کی اور اپنی بنگالی پوشاک میں چُپ چاپ بالکل دَم سادھ کر کھڑے ہو گئے۔ بابو اُما شنکر صاحب اور دو بین اور ساتھی ان کے اِرد گرد ایسے کھڑے ہو گئے جیسے وہ مورتی ہوں اور اُن کو دیکھ رہے ہوں۔ دو خواتین اور ایک صاحب دوسری طرف سے آئے تو بنگالی بابو کو مورتی سمجھ کر بہت غور سے دیکھنے لگے۔ ایک خاتون نے چُپکے سے بنگالی بابو کے ہاتھ لگا کر کہا کہ یہ تو بڑا ملائم ہے۔ بنگالی بابو جلدی سے بول اُٹھے "میں خواتین سے تو زیادہ ملائم نہیں ہوں"۔ اس پر ایک زبردست قہقہہ پڑا۔

ایک دن صبح اُٹھ کر چائے پیتے ہی اوپر حکیم صاحب کے کمرے میں پہنچا تو وہاں یوسف حسین نقوی صاحب موجود تھے۔ حکیم صاحب تو خیر علی الصباح اُٹھتے ہی ہیں، لیکن نقوی صاحب بھی سحر خیز ہیں۔ معلوم ہوا کہ آج اوکسفرڈ یونی ورسٹی کا پروگرام ہے۔ حکیم صاحب کی ایک دوست ہیں پروفیسر کیرس واڈی۔ یہ اوکسفرڈ میں پڑھاتی تھیں۔ اب تو رِٹائر ہو چکی ہیں۔ ستّر سے تو اوپر ہی معلوم ہوتی ہیں۔ بہت قابل خاتون ہیں۔ انھوں نے حکیم صاحب کو لنچ پر بُلایا تھا۔ چناں چہ ہم لوگ نقوی صاحب کی گاڑی میں بلکہ اُن کی گاڑی بانی (ڈرائیونگ) میں روانہ ہوئے۔ نقوی صاحب کار بہت اچھی چلاتے ہیں۔ کار چلانے میں تو حکیم صاحب بھی بہت ماہر ہیں۔ بہت بچپن سے کار ڈرائیونگ کر رہے ہیں، لیکن اب اتفاقیہ ہی کبھی کار چلاتے ہیں، کیوں کہ مصروفیت کے ساتھ ساتھ ذہنی مصروفیت بھی بہت زیادہ ہو گئی ہے، اس لیے ہمدردوں کا مشورہ ہے کہ آپ گاڑی خود نہ چلائیں، لیکن جہاں تک مجھے معلوم ہے حکیم صاحب سے کوئی حادثہ نہیں ہوا۔ بہر حال ہم لوگ چلے تو لندن شہر ہی ختم ہونے کا نام نہیں لیتا تھا۔ کوئی اسّی میل کے رقبے میں پھیلا ہوا شہر ہے۔ موسم اچھا تھا۔ بارش بھی ہوتی رہی، لیکن اوپر سے تو پانی کی دھاریں نظر آتی تھیں۔ زمین پر پانی دکھائی نہیں دیتا تھا۔ میں غور کرنے لگا کہ آخر یہ پانی کہاں چلا جاتا ہے۔ عجیب ناقدرے لوگ ہیں۔ پانی کو ذرا دیر بھی نہیں ٹھیراتے۔ ہمارے ہاں تو ایک دن بارش ہو جائے تو کئی کئی دن تک ہماری سڑکیں پانی کی مہمان نوازی کرتی رہتی ہیں۔

محترمہ کیرس واڈی سے فون پر نقوی صاحب نے پتا پوچھ لیا تھا۔ وہ محترمہ کے بتائے ہوئے نشانات کے مطابق مُڑتے جاتے تھے۔ یونی ورسٹی کے قریب پہنچ کر ایک چوراہے پر ذرا گڑبڑا گئے

اور بائیں طرف مُڑنے کے بجائے دائیں طرف مُڑ گئے۔ پتے کے مطابق موڑ مُڑ کر چند قدم چلنے کے بعد ایک شاپنگ سنٹر آنا تھا۔ وہ نہ آیا۔ ذرا اور آگے بڑھے تو کچھ دُکانیں نظر آئیں۔ وہاں میں اُترا۔ اسٹیشنری کی ایک چھوٹی سی دُکان میں جاکر دُکان دارنی سے پوچھا تو وہ بچاری خود بھی ناواقف تھی، مگر بھٹکے ہوئے کو راستہ نہ بتائے، یہ کیسے ہو سکتا ہے! فوراً کام چھوڑ کر الماری میں سے اوکسفرڈ پر ایک کتابچہ اُٹھایا اور نقشہ دیکھ کر "ناہم روڈ" تلاش کرنے لگی۔ اتنے میں ایک خریدار بڑی بی کے کان میں بات پڑی تو جلدی سے بولیں، "آئیے میں بتاتی ہوں"۔ دُکان سے باہر نکل کر کہنے لگیں آپ لوگ اپنی گاڑی میری گاڑی کے پیچھے پیچھے رکھیے۔ جب میں ہاتھ گاڑی سے باہر نکالوں تو اس کے بعد جو گلی آئے آپ اُس میں مُڑ جائیں، بس وہی ناہم روڈ ہے"۔ کتنے اچھے انسان ہیں یہ لوگ۔ خضرِ راہ کا کام کرتے ہیں۔ میں نے دل میں سوچا کہ یہ انگریز اتنے اچھے ہیں تو انھوں نے ہماری آزادی کیوں چھینی تھی، ہمارے ملک پر کیوں قبضہ جمایا تھا۔ شاید حکومت کا شوق آدمی کو بدل دیتا ہے۔ یا پھر انگریز ذاتی حیثیت میں اچھے ہوں اور قومی حیثیت سے ان کا مزاج دوسرا ہو، یا شاید ہماری کم زوری سے فائدہ اُٹھایا ہو۔ جس طرح طاقت انسان کو بہکا دیتی ہے اسی طرح کم زوری بھی جُھکا دیتی ہے۔ بہرحال خوبی خوبی ہے اور خوبی کا اعتراف بھی ایک خوبی ہے۔ اچھی باتیں کسی میں بھی ہوں ہمیں سیکھنی چاہییں۔

پروفیسر کیرس واڈی کے ہاں پہنچے تو وہ منتظر تھیں۔ مسکرا کر ملیں۔ سب سے پہلے پوچھا، "کسی کو منھ ہاتھ دھونا ہو تو دھولیں"۔ مہمان نوازی کا یہ پہلا اظہار تھا۔ واڈی صاحبہ کا مطالعہ بہت وسیع ہے۔ وہ خلیق اور منکسر بھی ہیں۔ انھوں نے "دی مسلم مائنڈ" (THE MUSLIM MIND) کے نام سے ۱۹۷۶ء میں ایک کتاب لکھی تھی، جس میں اسلام کو تاریخ اور موجودہ زمانے کی روشنی میں سمجھنے کی کوشش کی ہے۔ انھوں نے لکھا ہے کہ مغرب کے سیکھنے کے لیے اسلام میں بہت کچھ ہے۔ اس کتاب کا دوسرا ایڈیشن آنے والا تھا۔ پروفیسر واڈی کے ساتھ ایک اور بزرگ خاتون مس کرسٹائن مارسین رہتی ہیں۔ وہ بھی ریٹائر ہو چکی ہیں۔ انگریزی کی پروفیسر تھیں۔ وہ بھی ضعیف ہیں۔ شاید اس گھر میں دونوں تنہا رہتی ہیں۔ خاطر مدارات میں دونوں آگے آگے تھیں۔

۱۶

پروفیسر کیرس واڈی نے پروفیسر جیسپر گریفن، مسٹر گارتھ لین اور مس میری ایمبلٹن کو بھی ہم سے ملانے کے لیے بُلا رکھا تھا۔ پروفیسر جیسپر گریفن اوکسفرڈ یونی ورسٹی میں یونانی زبان اور ادب پڑھاتے ہیں۔ وہ کوئی بیس سال سے بیلیَل کالج اوکسفرڈ سے متعلق ہیں۔ وہ نقاد بھی ہیں اور ٹائمز کے ادبی صفحات میں ادبی تنقیدیں لکھتے ہیں۔ تپاک سے ملے۔ وہ ۱۹۷۹ء میں پاکستان آچکے ہیں۔ حکیم صاحب نے شامِ ہمدرد کے تحت کراچی، لاہور، راول پنڈی اور پشاور میں ان کے چار لکچر بھی کرائے تھے، جس میں سے ایک اوکسفرڈ میں تدریس اور تحقیق کے بارے میں بھی تھا۔ باقی لکچر بھی ادبی موضوعات پر تھے۔ ایک اور ادیب گارتھ لین اور ایک خاتون مس میری ایمبلٹن بھی شریکِ محفل تھیں۔ یہ خاتون ابھی نوعمر ہیں اور اوکسفرڈ میں مصر اور برطانیہ کے تعلقات اُن کا موضوع ہے۔ ہماری یونی ورسٹیوں کے برعکس مغربی ملکوں میں یونی ورسٹیاں طالب علموں کو صرف پڑھا کر ڈگریاں نہیں دیتیں۔ وہ علم کو آگے بڑھانے کے تمام طریقے اختیار کرتی ہیں۔ تحقیق بھی کرتی ہیں۔ ان خاتون نے مصر اور برطانیہ کے تعلقات کو اپنے مطالعے اور تحقیق کا موضوع بنایا ہے۔ آہستہ آہستہ یہ اس موضوع میں ماہر شمار ہونے لگیں گی اور پھر حکومت بھی ان کے علم سے فائدہ اُٹھائے گی اور مصر کے معاملات میں ان سے مشورہ لے گی۔ ڈاکٹر واڈی نے خاطر تواضع کا خاصا انتظام کیا تھا۔ مس ماریسن اور مس ایمبلٹن بھی اُن کی مدد کر رہی تھیں۔ اِصرار کر کر کے کھلا رہی تھیں۔ علمی باتیں بھی ہو رہی تھیں۔ مس واڈی کا گھر چھوٹا سا ہے۔ کھڑکی کے باہر درخت اور پودے بہار دے رہے تھے۔ سردی تھی، لیکن لُطف آ رہا تھا۔ اچھا موسم، پُرسکون ماحول اور علمی لوگوں کی صحبت، اس سے بڑھ کر اور کیا چاہیے۔ دل کب چاہتا کہ یہ محفل ختم ہو، لیکن ہم بھی مسافر تھے۔ وقت کم تھا۔ اوکسفرڈ یونی ورسٹی

بھی دیکھنی تھی۔ یہ برطانیہ کی سب سے پرانی اقامتی یونی ورسٹی ہے۔ یہاں ۲۱ مردانہ کالج اور ۵ زنانہ کالج ہیں۔ سب سے پرانا کالج 'یونی ورسٹی کالج' ہے جس کا آغاز ۱۲۴۹ء میں ہوا تھا۔ سب سے نیا کالج سینٹ کیتھرائن کالج ہے جو ۱۹۶۲ء میں قائم ہوا ہے۔ یونی ورسٹی کا سربراہ چانسلر ہوتا ہے، لیکن سارا انتظام وائس چانسلر ہی کرتا ہے۔ ہر کالج کا منتظم ڈین کہلاتا ہے۔ یہاں بوڈلین لائبریری بھی ہے جو برطانیہ کی چار بڑی لائبریریوں میں سے ہے۔ ان چاروں لائبریریوں میں ملک میں چھپنے والی ہر کتاب آتی ہے۔ اس لائبریری کا نام مشہور عالم اور مدبّر سر تھامس بوڈلے کے نام پر رکھا گیا ہے۔

اوکسفرڈ یونی ورسٹی کی سب سے بڑی جلسہ گاہ "شیلڈونین تھیٹر" ہے۔ یہاں انتظامی جلسے

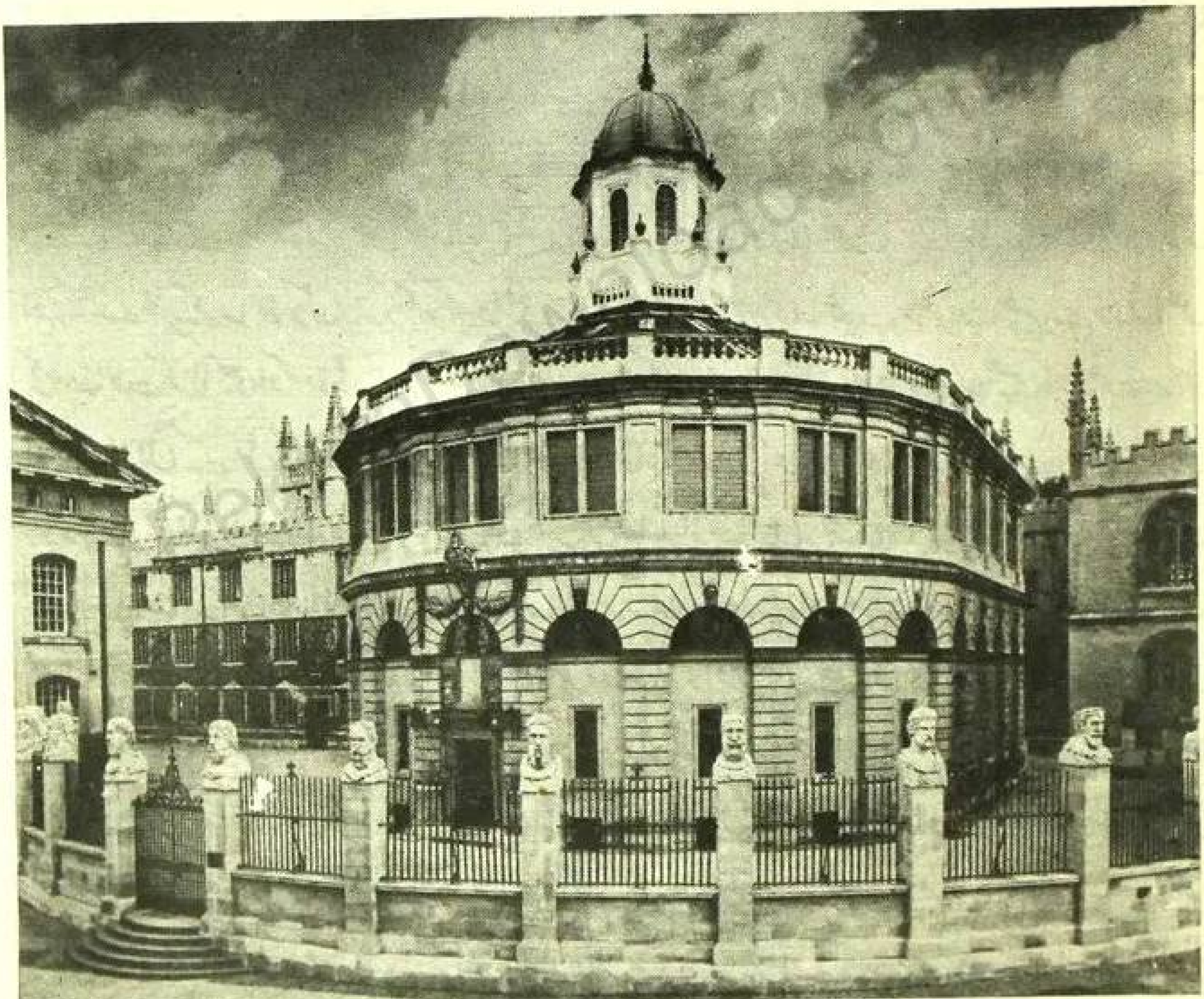

شیلڈونین تھیٹر ــــ بیرونی منظر

بھی ہوتے ہیں اور یونی ورسٹی کی عام تقریبیں بھی۔ اس کا نام ایک پادری گلبرٹ شیلڈن کے نام پر رکھا گیا ہے جس نے اس تھیئٹر کی تعمیر کا کُل خرچ برداشت کیا تھا۔ یہ ایک بہت بڑا ہال ہے اور دیکھنے سے تعلق رکھتا ہے۔ سترھویں صدی میں جب یہ بنایا گیا تھا اُس وقت فنِ تعمیر نے اتنی ترقی نہیں کی تھی۔ اوکسفرڈ میں فلکیات کے ایک پروفیسر تھے کرسٹوفر رین۔ ان کو عمارت بنانے کے فن سے دِل چسپی ہو گئی۔ چناں چہ وہ قدیم رُوم کی یادگار عمارتیں دیکھنے پہنچ گئے۔ وہاں انھوں نے دیکھا کہ جلسوں اور اجتماعوں کے لیے سب سے موزوں عمارت تھیئٹر کی ہے، جس میں حاضرین کی بہت بڑی تعداد بیٹھ سکتی ہے، لیکن رُوم کے تھیئٹر چھت کے بغیر کُھلے ہوئے ہوتے ہیں۔ انگلستان کے موسم میں بے چھت عمارت کار آمد نہیں تھی، لیکن چھت کے لیے کھمبے (ستون) کھڑے کرنے سے رُوم کے تھیئٹر کا نقشہ بالکل بدل جاتا تھا، لیکن رین صاحب کی لگن نے اس کا راستہ نکال لیا اور ۷۰ فیٹ چوڑی چھت کو اوپر سے کمانیں لگا کر سہارا دیا کہ نیچے سے چھت ہموار نظر آتی تھی اور رنگ روغن اس طرح کیا کہ رومن تھیئٹر کی طرح کُھلے آسمان کا سا منظر دکھائی دیتا ہے۔ کرسٹائن ماریسن صاحبہ ہمیں لے کر سب سے پہلے شیلڈونین تھیئٹر پہنچیں۔ تھیئٹر بند تھا، لیکن انھوں نے کھلوا لیا اور بڑی خوشی اور بڑے فخر کے ساتھ دکھایا۔ دیکھ کر واقعی ہمیں بھی خوشی ہوئی۔ عجیب و غریب چیز ہے اور اس کی حفاظت کرنا بھی اوکسفرڈ والوں کا ہی کام ہے۔ حکیم صاحب قبلہ نے بڑی دِل چسپی اور غور سے اس کو دیکھا۔ ان کے دِل و دماغ پر مدینۃُ الحکمت حاوی ہے اور وہ اسی خیال سے بہت سی چیزوں کو دیکھتے ہیں کہ ان سے مدینۃُ الحکمت کی تعمیر میں فائدہ اُٹھائیں۔ بڑی بی حکیم صاحب کی دِل چسپی سے بہت متاثر ہوئیں۔ ان کی آنکھیں چمک اُٹھیں۔ وہ بڑھاپے اور کم زوری کے باوجود ہمیں جس جوش و خروش سے اوکسفرڈ دِکھا رہی تھیں اس سے یونی ورسٹی سے ان کی محبت ظاہر ہوتی تھی۔

محترمہ نے یقیناً پڑھا بھی اوکسفرڈ ہی میں ہو گا۔ مجھے یاد آیا مولانا محمد علی جوہر نے بھی یہیں پڑھا تھا اور ڈوب کر پڑھا تھا۔ ان کی انگریزی اتنی اچھی تھی کہ انگریز بھی مانتے تھے اور بڑے شوق سے پڑھتے تھے۔ ایک بار ایک رانی صاحبہ ان کی انگریزی گفتگو سُن کر پوچھ بیٹھیں کہ مولانا، آپ نے اتنی اچھی انگریزی کہاں سیکھی؟ مولانا بولے، میں نے انگریزی ایک چھوٹے سے قصبے میں سیکھی ہے۔ رانی نے بڑی حیرت اور اشتیاق سے اس قصبے کا نام پوچھا تو مولانا نے بڑی سادگی سے جواب دیا، "اوکسفرڈ"۔

اوکسفرڈ کی عمارتیں اور درس گاہیں دیکھ کر میرا دل چاہا کہ میں پوچھوں اور دیکھوں کہ مولانا کہاں

شیلڈونین تھیٹر — اندرونی منظر

رہتے تھے، کہاں پڑھتے تھے، کن گلیوں میں گھومتے پھرتے تھے، کہاں شرارتیں کرتے تھے۔

ماریسن صاحبہ نے ہمیں کئی کالج دکھائے۔ "نیو کالج" کے اندر بلکہ اوپر لے گئیں جہاں طالب علم اور اُستاد رہتے ہیں۔ کہنے لگیں، "یہ نیا کالج صرف ۶ سو سال پرانا ہے۔" نیو کالج ۱۳۷۹ء میں قائم ہوا تھا۔ اس کالج کی عمارت پہلی چوگوشہ عمارت ہے جس کے درمیان لان اور پھلواری بہت خوب صورت معلوم ہوتی ہے۔ جب ہم واپس آنے لگے تو پھاٹک (گیٹ) پر موجود آدمی نے بتایا کہ ٹکٹ لینا ضروری ہے۔ اس نے داخل ہوتے وقت اخلاقاً ہمیں نہیں روکا، واپسی کے وقت بتایا۔ حکیم صاحب نے جلدی سے ٹکٹ کے پیسے ادا کیے۔ ماریسن صاحبہ افسوس کرنے لگیں کہ ٹکٹ لگا دیا گیا ہے۔ ان کو یہ بات پسند نہیں تھی کہ کسی درس گاہ میں داخلہ ٹکٹ سے ہو، لیکن میرا خیال ہے کہ عمارتوں کی حفاظت اور مرمت وغیرہ کے لیے یہ طریقہ ایجاد کیا گیا ہے۔ انگلستان کی آب و ہوا مرطوب ہے، اس لیے عمارتیں کالی پڑ جاتی ہیں۔ گزشتہ برسوں میں عمارتوں خاص طور پر پتھّر سے بنی ہوئی عمارتوں کی صفائی اور مرمت پر کروڑوں پاؤنڈ خرچ کیے گئے ہیں۔

۱۷

اوکسفرڈ یونی ورسٹی کی عمارتیں ہمارے ہاں کی یونی ورسٹی کی طرح اکٹھی نہیں ہیں کہ ایک کے بعد دوسری عمارت ہو۔ اس یونی ورسٹی کی عمارتیں آبادی میں ملی جلی ہیں۔ ایک کالج یا ہوسٹل ہے، اس کے برابر عام مکانات اور دُکانیں ہیں، پھر کوئی دوسرا کالج آگیا۔ اسی طرح یونی ورسٹی کی عمارتیں شہر میں پھیلی ہوئی ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ یہ یونی ورسٹی ایک بار نہیں بنی بلکہ ضرورت کے مطابق وقتاً فوقتاً کالج اور ان کی عمارتیں بنتی رہیں اور یہ سب کالج یونی ورسٹی کا حصّہ ہیں۔

یونی ورسٹی کی سیر کر چکے تو مادیسن صاحبہ کہنے لگیں میں بس سے واپس چلی جاؤں گی، آپ لوگ

دائیں سے بائیں: پروفیسر پیٹر ایوری، یوسف حسین نقوی، حکیم محمد سعید، ڈاکٹر معزالدین اور مسعود احمد برکاتی، کیمبرج میں

مجھے گھر پہنچانے کی تکلیف نہ کریں، لیکن یہ کیسے ہو سکتا تھا۔ ان کو اصرار کر کے کار میں بٹھا لیا۔ ان کے گھر پہنچے تو ڈاکٹر کیرس واڈی گھر کے باہر ہمیں خدا حافظ کہنے کے لیے انتظار میں کھڑی تھیں۔ کہنے لگیں، ایک پیالی چائے اور پیتے جائیں۔ ہم نے شکریہ ادا کیا اور اجازت لی۔

لندن میں پروفیسر رالف رسل صاحب سے ملاقات نہ ہو سکی وہ کہیں گئے ہوئے تھے۔ اردو کے شیدائی اور سرگرم کارکن ہیں۔ انھوں نے اردو سیکھنے کی ابتدا ہندستان سے اپنی فوجی ملازمت کے دوران کی تھی۔ وہاں ایک سکھ اور ایک پٹھان سے اُن کو اردو سیکھنے میں مدد ملی تھی۔ وہ ۱۹۴۲ء میں دوسری جنگ کے زمانے میں کراچی بھی آئے تھے اور پاکستان ہندستان کے کئی شہروں میں رہے۔ اردو اخبارات دیکھ دیکھ کر انھوں نے اردو لکھنے کی مشق کی۔ اس میں شک نہیں کہ اخبارات نے اردو کو مقبول بنانے میں بڑا حصّہ لیا ہے۔ آج بھی اخبارات یہ کام کر رہے ہیں۔ یہ اور بات ہے کہ اب صحافی پہلے کے صحافیوں کی سی محنت نہیں کرتے۔ رسل صاحب نے غالب اور بعض دوسرے اردو شعرا پر انگریزی میں کتابیں بھی لکھی ہیں اور اردو پڑھائی بھی ہے۔ وہ بہت اچھی اردو جانتے ہیں اور خوب بولتے ہیں اور خوب قہقہے لگاتے ہیں۔ وہ پاکستان بھی کئی بار آچکے ہیں۔ وہ کچھ عرصے سے انگلستان میں اردو کو رائج کرنے کی کوشش کر رہے ہیں۔ جو شخص بھی اردو کی خدمت کرے وہ اپنا عزیز ہو جاتا ہے۔ رسل صاحب کو تو اردو سے اتنی محبّت ہے کہ وہ شاید انگریزی ادب سے زیادہ اردو ادب سے واقف ہو گئے ہیں۔

لندن اتنا بڑا شہر ہے اور اس میں اتنی چیزیں دیکھنے اور اتنے لوگ ملنے کے قابل ہیں کہ بہت سا وقت ہو جب اطمینان سے لندن کو سمجھا اور تلاش کیا جا سکتا ہے۔ یہاں پاکستان کے بھی لاکھوں لوگ ہیں۔ سیاسی لیڈر بھی خاصے ہیں۔ اردو ادیب شاعر بھی خاصی تعداد میں ہیں، خیر اُن سے تو اپنے وطن ہی میں ملاقات ہو گی۔

کیمبرج بھی بڑی پرانی یونی ورسٹی ہے۔ کیمبرج شہر بھی دیکھنے سے تعلق رکھتا ہے۔ یہ کیم (CAM) ندی کے کنارے واقع ہے۔ کیمبرج یونی ورسٹی بھی اوکسفرڈ یونی ورسٹی کی طرح یورپ کی قدیم ترین یونی ورسٹیوں میں سے ہے، جن میں طالبِ علموں کے ٹھیرنے کا بھی انتظام ہے۔ کیمبرج میں اٹھارہ مردانہ کالج اور دو زنانہ کالج ہیں۔ کیمبرج یونی ورسٹی کی ابتدا تیرھویں صدی عیسوی میں ہوئی تھی۔ اس کا سب سے کم عمر کالج چرچل کالج ہے جو ۱۹۶۰ء میں قائم ہوا ہے۔ یونی ورسٹی کے ہاسٹلوں میں رہنے والے

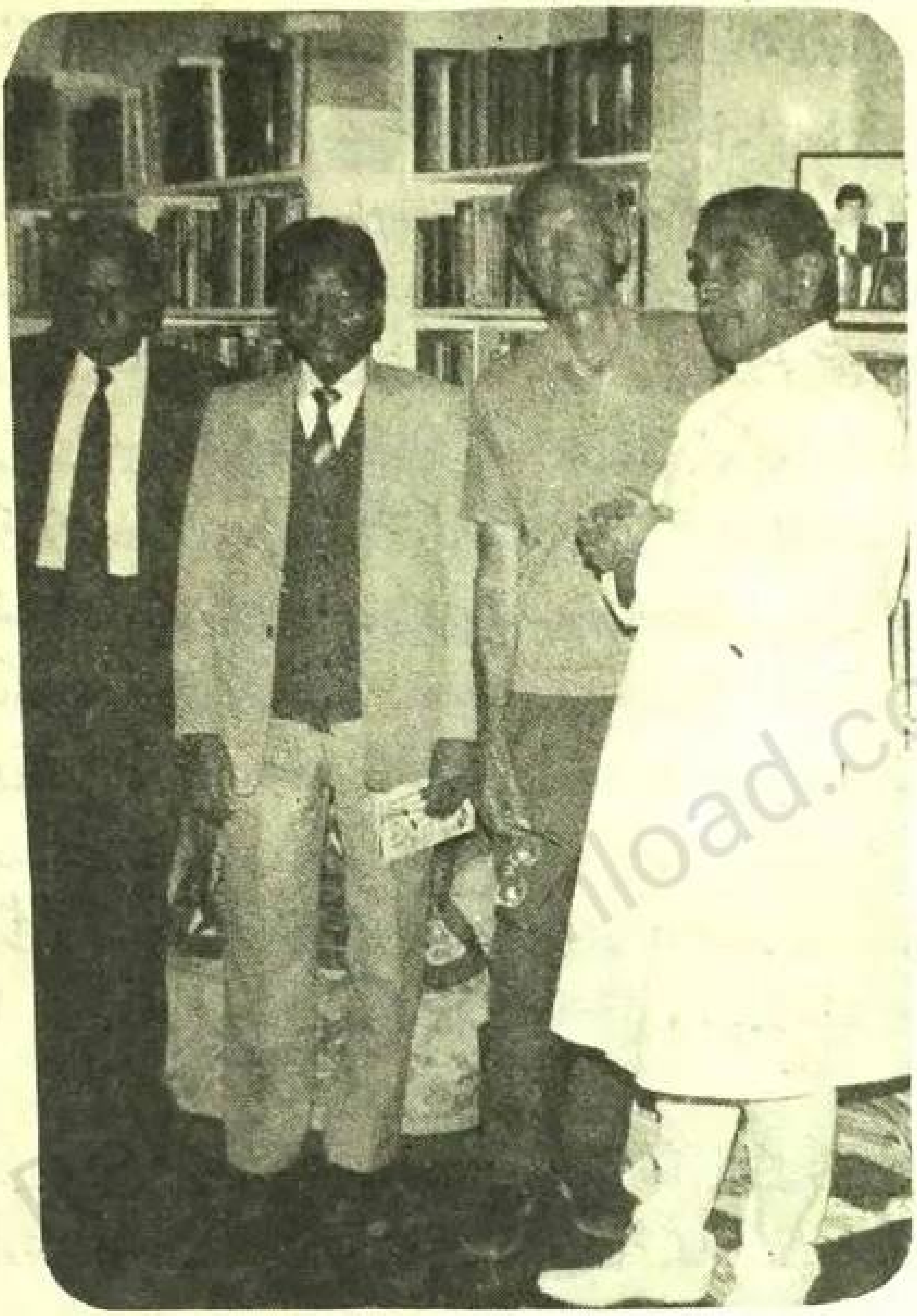

دائیں سے بائیں:-
حکیم محمد سعید
مسٹر اسٹیفن
ڈاکٹر معز الدین
اور
یوسف حسین نقوی

طالب علموں کی تعداد کم و بیش دس ہزار ہے۔ اس کا سربراہ چانسلر ہوتا ہے، لیکن کام وائس چانسلر چلاتا ہے، جس کو اُستاد اپنے ہی میں سے دو سال کے لیے منتخب کرتے ہیں۔ یونی ورسٹی کا اپنا اشاعتی ادارہ ہے جو "کیمبرج یونی ورسٹی پریس" کہلاتا ہے اور عمدہ عمدہ معیاری کتابیں شائع کرتا ہے۔ اسی طرح "اوکسفرڈ یونی ورسٹی پریس" بھی ہے۔ ہمارے ہاں بہت سے لوگ "پریس" کے لفظ سے یہ سمجھتے ہیں کہ چھاپے خانہ ہوگا۔ جب سے ہمدرد اکیڈمی کا نام بدل کر "ہمدرد فاؤنڈیشن پریس" رکھا ہے بعض لوگ

سمجھنے لگے ہیں کہ ہمدرد نے اپنا پریس لگایا ہے۔

کیمبرج یونی ورسٹی نے یورپ میں علم کی روشنی پھیلانے میں بہت حصّہ لیا ہے۔ علامّہ اقبال نے کیا خوب لکھا تھا "کیمبرج وہ سرچشمۂ علم و فضل ہے جس نے یورپی تہذیب و تمدّن کی ترکیب میں سب سے زیادہ حصّہ لیا ہے۔"

کیمبرج میں ہم ڈاکٹر معز الدین صاحب اور اسٹیفن صاحب سابق ایڈیٹر اسٹیٹسمین کے علاوہ پروفیسر پیٹر ایوری سے بھی ملے۔ ایوری صاحب یونی ورسٹی کے شعبۂ فارسی اور مشرقِ وسطیٰ کے صدر ہیں اور فارسی زبان کے علاوہ مشرقِ وسطیٰ کے حالات کے بارے میں بھی بڑی وسیع معلومات رکھتے ہیں۔ حکیم صاحب کو پہلے سے جانتے تھے۔ ان کی کتابیں پڑھ چکے ہیں۔ بہت اچھی طرح ملے۔ اپنے کالج کا گرجا دکھانے لے گئے۔ ہر کالج میں گرجا ضرور ہوتا ہے۔ گرجا اگرچہ سنسان سا تھا، لیکن عمارت اور فرنیچر بہت اعلا تھا، پھر ایوری صاحب کے دفتر میں بیٹھ کر خاصی دیر مختلف موضوعات پر باتیں ہوئیں۔ ان کے ساتھ ایک تصویر بھی کھنچوائی۔

لندن میں ایک دن صبح حکیم صاحب نے اپنی سکریٹری خانم ڈی سلوا سے فون پر بات کی اور اپنے امریکا اور کینیڈا آنے کا پروگرام بتایا۔ میں نے بھی خانم سے دُعا سلام کی۔ کہنے لگیں کہ لندن اور پیرس خوب اچھی طرح دیکھنا۔ میں نے کہا کہ وقت کم ہے اور کام بہت، مگر کوشش تو یہی ہے۔ خانم ڈی سلوا آج کل کینیڈا میں اپنے بیٹوں کے پاس ہیں۔ بہت قابل، محنتی اور ہمدرد خاتون ہیں۔ انسان دوستی میں بہت کم لوگ آج کل کے زمانے میں اُن کا مقابلہ کر سکتے ہیں۔ ایک بہن کی طرح چاہتی ہیں۔ ہمدرد کی خدمت دِل و جان سے کرتی ہیں۔ انگریزی بہت اچھی ہے۔ کام میں لگی رہتی ہیں، پھر بھی خوش مزاجی اور اخلاق کا دامن ہاتھ سے نہیں چھوڑتیں۔ انھوں نے اپنے لڑکوں کو بھی اسی انداز پر اُٹھایا ہے۔ تینوں لڑکے سعادت مند اور خلیق ہیں۔

حکیم صاحب پیرس سے امریکا ہوتے ہوئے کینیڈا جائیں گے اور انھی کے ہاں ٹھیریں گے۔ میں پیرس سے واپس پاکستان چلا جاؤں گا۔ حکیم صاحب وہاں سائنسی مراکز دیکھیں گے اور ماہرینِ تعمیرات سے مشورہ کریں گے اور مدینۃ الحکمت میں جو سائنس گھر بنانا چاہتے ہیں اُس کے لیے حکیم صاحب کے ذہن میں جو منصوبہ ہے اس کے مطابق ماہرین کی رائے لیں گے۔ آج کے دور میں سائنس کی اہمیت کے پیشِ نظر پاکستان میں سائنس کا فروغ بہت ضروری ہے۔

۱۸

لندن اور پیرس میں ہر دُکان دار قیمتوں کی میزان کیلکولیٹر سے لگاتا ہے۔ مشینوں کی ایجاد نے انسان کو جہاں فائدے اور سہولتیں پہنچائی ہیں وہاں نکما بھی کر دیا ہے۔ ذہن اور جسم سہارے کے اتنے عادی ہو گئے ہیں کہ چاہتے ہیں کہ نہ سوچنے کی تکلیف ہو اور نہ ہاتھ پیر چلانے پڑیں۔ میں نے کئی بار دیکھا کہ چند چیزوں کی قیمتیں جوڑنے میں کیلکولیٹر کچھ زیادہ ہی وقت لے لیتا ہے۔ بعض وقت زبانی حساب جلدی اور آسانی سے ہو جاتا ہے۔ ایک بار لندن میں چھوٹی بڑی کوئی دس بارہ چیزیں لیں تو دُکان دار نے مشین پر انگلیاں چلانی شروع کیں اور میں نے دل میں حساب لگانا شروع کیا۔ دُکان دار نے کہا کہ سولہ پاؤنڈ ہوئے، میں نے کہا "پندرہ پاؤنڈ"۔ اس نے دوبارہ کیلکولیٹر پر حساب کیا اور تسلیم کیا کہ میری میزان صحیح ہے، مگر اب تو ہمارے ہاں بھی کیلکولیٹر عام ہو گئے ہیں۔ دُکانوں کے علاوہ کالجوں میں بھی طالب علم معمولی معمولی سوال اسی سے حل کرتے ہیں۔ امتحان میں بھی کیلکولیٹر ساتھ لے جانے کی اجازت ہو گئی ہے۔ نتیجہ یہ ہے کہ طالبِ علم جو حسابی طریقہ سیکھتا ہے اس پر عمل کرنے کی پوری مشق اور ذہنی تربیت نہیں ہوتی۔ مشین انسان کو فائدہ بھی پہنچا سکتی ہے اور نقصان بھی۔ جو ملک جتنا زیادہ ترقی یافتہ ہے اتنا ہی وہ مشینوں سے کام لے رہا ہے۔ آئے دن نئی نئی مشینیں ایجاد ہو رہی ہیں۔ یورپ کے ملکوں سے زیادہ امریکا میں مشینوں سے کام لینے کا رواج ہے۔ مشینیں انسان کے ذہن اور علم کی پیداوار ہیں اور ان کا مقصد انسانوں کی محنت کو کم کرنا اور کام میں صفائی اور تیزی پیدا کرنا ہے، مگر ان کے زیادہ استعمال سے بہت سے مسئلے بھی پیدا ہوتے ہیں۔ ایک مسئلہ یہ بھی ہے کہ مشینوں نے بہت سے آدمیوں کو بے کار کر دیا ہے اور وہ بے روزگار ہو گئے ہیں۔ ایک مسئلہ یہ بھی ہے کہ انسان محنت کی عادت سے محروم ہوتا جا رہا ہے اور اس کی صحت پر اثر پڑ رہا ہے، کیوں کہ جسمانی مشقت کی ضرورت کم سے کم ہو رہی ہے اور بیٹھے بیٹھے ہی بہت سے کام بٹن دبا کر ہو جاتے ہیں۔ صحت کے لیے محنت و مشقت ضروری ہوتی ہے۔ محنت نہ کرنے سے اخلاقی خرابیاں بھی پیدا ہوتی ہیں۔ محنت ذاتی اور قومی ترقی کے لیے بھی ضروری ہے اور یہ

اخلاقی خوبی ہے۔ محنتی آدمی اعلا اخلاقی صفات کا مالک ہوتا ہے۔ سائنس کی ترقی اور مشینوں کی ایجاد اور رواج سے فائدوں کے ساتھ جو مسلے پیدا ہوتے ہیں اُن پر بھی غور کرنا چاہیے۔ سائنس سے اس طرح فائدہ اُٹھانا چاہیے کہ تہذیب کو نقصان نہ ہو۔

کہتے ہیں کہ انگلستان جانا ہو تو لندن کے ہوائی اڈے پر ہی ویزا مل جاتا ہے۔ کوئی اگر اپنے ملک سے ویزا لے کر نہ گیا ہو تو لندن پہنچ کر بھی ویزا بن جاتا ہے۔ یہ ویزا پورے ملک کے لیے ہوتا ہے۔ جب ایک بار ویزا مل گیا تو پھر ملک کے جس شہر جس صوبے میں چاہے جاؤ، کوئی پابندی نہیں ہے۔ ہر ہر شہر کا ویزا لینے کی ضرورت نہیں ہے، کیوں کہ ویزا میں شہروں کا اندراج نہیں ہوتا۔ یہ طریقہ تو شاید صرف ہندستان اور پاکستان ہی میں ہے کہ ویزا میں جن شہروں کے نام لکھے ہوں، آپ صرف انھی شہروں میں جا سکتے ہیں۔

میں نے لندن اور پیرس جانے سے پہلے ہی ویزا کراچی میں حاصل کر لیا تھا۔ فرانس والوں نے تو مجھے ذاتی طور پر بُلائے بغیر ہمدرد کے نمائندے کو ہی ویزا دے دیا تھا، لیکن برطانوی قونصل خانے نے ذاتی طور پر قونصل جنرل سے ملنے کے لیے بُلایا۔ میں گیا تو بیسیوں سوالات کیے۔ ذاتی قسم کے سوالات بھی کیے، جو عام طور پر مہذّب آدمی سے پہلی ملاقات میں نہیں کیے جاتے، مثلاً کیا کرتے ہیں؟ ہمدرد فاؤنڈیشن میں کب سے کام کرتے ہیں؟ کراچی میں مکان اپنا ہے یا کرائے کا؟ کتنے بچّے ہیں؟ کتنی بار انگلستان جا چکے ہیں؟ وہاں قیام کہاں رہے گا؟ غرض بہت سے ذاتی معاملات بھی پوچھے۔ مجھے اُلجھن ہونے لگی کہ یہ تو پورا کچا چٹھا کھلوا رہے ہیں۔ ذرا بھی تکلّف نہیں کر رہے۔ میں نے بھی بعض سوالات کے جوابات میں صاف صاف کہا کہ مجھے نہیں معلوم، لیکن انھوں نے ویزا دے دیا۔ میں سوچنے لگا کہ ہمارے ہزاروں پاکستانی بھائی برطانیہ میں ہیں اور ہزاروں روزانہ جاتے رہتے ہیں۔ شاید یہ اس کا اثر ہے۔ کیا ہم پاکستانی کہیں جاتے ہیں تو ایسا اثر چھوڑتے ہیں۔ حکیم صاحب کا ویزا تو برطانوی سفارت خانے والوں نے ہمدرد کے نمائندے کو ہی دے دیا تھا۔

ہم ہندستان جاتے ہیں تو ہر شہر میں کوتوالی یا تھانے میں پاس پورٹ اور ویزا ساتھ لے جا کر اپنی آمد لکھوانی پڑتی ہے اور جب اس شہر سے روانہ ہوتے ہیں تو اس وقت بھی یہی کام کرنا پڑتا ہے، بلکہ بعض شہروں میں تو پولیس کے مرکزی دفتر اور محلّے کے تھانے میں بھی اندراج کرانا پڑتا ہے اور مسافر کو بہ ذاتِ خود حاضری دینی پڑتی ہے۔ پاکستان میں بھی یہی ہوتا ہے بلکہ یہاں تو جس شخص کے ہاں

کوئی بیرونی مہمان آکر ٹھہرا ہے اس کا بھی شناختی کارڈ دِکھانا پڑتا ہے، لیکن لندن اور پیرس دونوں جگہ ہوائی اڈّے پر ہی جو اندراج ہو گیا وہ ہو گیا۔ اس کے بعد کہیں تھانے چوکی جانے کی ضرورت نہیں پڑتی۔ اگر انھوں نے اطلاع دی ہو گی تو خود ہی دے دی ہو گی۔

لندن اور پیرس اور سارے یورپ کے ہوائی اڈّے بہت عمدہ بنے ہوئے ہیں۔ ہوائی اڈّوں کی عمارتیں اس طرح بنی ہوتی ہیں کہ جہاز اُن کے دروازے پر جاکر لگ جاتا ہے۔ عمارت کے دروازے سے ایک لچک دار کوری ڈور (راہداری) لگی ہوتی ہے۔ اس لچک دار راہداری کا دوسرا سِرا ہوائی جہاز کے دروازے سے مِلا دیا جاتا ہے۔ مسافر اس راہداری سے گزر کر عمارت کے اندر پہنچ جاتے ہیں۔ گرمی ہو، سردی ہو یا برسات، مسافر کو کچھ پتا نہیں چلتا۔ وہ آرام سے عمارت کے اندر پہنچ جاتا ہے اور وہاں سے شہر چلا جاتا ہے یا کسی دوسرے شہر جانا ہو تو پھر اسی طرح عمارت سے دوسرے ہوائی جہاز میں پہنچ جاتا ہے۔ پاکستان اور ہندُستان میں ابھی تک ہوائی اڈّے ایسے نہیں بنے ہیں۔ یہاں تو آپ کو ہوائی جہاز سے سیڑھی کے ذریعے سے پہلے ہوائی میدان میں اُترنا پڑتا ہے، پھر بس میں بیٹھ کر عمارت تک پہنچتے ہیں۔ ہوا، سردی، گرمی اور بارش سب کو بُھگتنا پڑتا ہے۔ دل چسپ بات یہ ہے کہ اس کے باوجود ایئر پورٹ ٹیکس بھی لگا ہوا ہے کہ کرائے کے علاوہ یہ ٹیکس بھی مسافر کو ادا کرنا پڑتا ہے، لیکن یورپ میں کوئی ایئر پورٹ ٹیکس نہیں ہے اور سہولتیں ساری موجود ہیں۔

انگریزوں کی ایک خصوصیت یہ ہے کہ ہر خیال اور ہر رائے کے لوگوں کو بڑی فراخ دلی سے برداشت کرتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ وہاں مختلف خیالات رکھنے والے لوگ پناہ لیتے ہیں۔ لندن شہر کی آغوش ہر شخص کے لیے کُھل جاتی ہے۔ اسی لندن میں اشتراکیت کا بانی اور مشہور مفکّر کارل مارکس جاکر کئی برس رہا اور اپنی مشہور انقلابی کتاب سرمایہ (ڈاس کیپٹال) لکھی۔ اس کتاب کا مواد اس نے برٹش میوزیم میں بیٹھ کر جمع کیا تھا۔ آج بھی اس کتاب کے پہلے ایڈیشن کا ایک نسخہ برٹش میوزیم میں رکھا ہے۔ مشہور موسیقار موزارٹ (۱۷۵۶ء تا ۱۷۹۱ء) اوسٹریا میں پیدا ہوا تھا۔ اس نے بچپن سے ہی موسیقی کی دُھنیں بنانا شروع کر دی تھیں۔ موزارٹ لندن میں رہا اور اس نے یہیں بارہ برس کی عمر میں پہلی دُھن بنائی۔

جس دن لندن سے پیرس جانا تھا (۵ ستمبر ۱۹۸۲ء) اُس صبح روانگی کا وقت دیکھنے کے لیے ٹکٹ کھولا تو معلوم ہوا کہ حکیم صاحب کی روانگی کا وقت تو ڈیڑھ بجے دوپہر ہے اور میری روانگی شام چار بجے

پیرس کے سب سے حسین بازار شانزالیزے کی ایک تصویر جو مصنف نے کھینچی۔

ہو گی۔ ارے یہ کیا؟ گویا ہم الگ الگ جائیں گے اور لوگوں کو بار بار تکلیف ہو۔ پیرس پہنچ کر بھی دقّت ہو۔ ہمدرد کے نمائندے سے یہ بہت بڑی چوک ہو گئی کہ اس نے یہ غور نہیں کیا کہ اتنی ذرا سی بات میں کتنی عملی دقّت شامل ہے۔ خیر اسی وقت ٹیلے فون کھڑکائے گئے اور ہوائی اڈے سے رابطہ قائم کر کے درخواست کی گئی تو انھوں نے کہا کہ آپ بھی ہوائی اڈّے حکیم صاحب کے ساتھ ہی پہنچ جائیے۔ ہم کوشش کریں گے کہ ڈیڑھ بجے جانے والی "ایر بس" میں آپ کو بھی جگہ دے دیں۔ خیر کچھ اطمینان ہوا، پھر بھی دھڑکا لگا رہا کہ کہیں جگہ نہ ملے۔ بہر حال جگہ مل گئی اور میں حکیم صاحب کے ساتھ ہی ایئر فرانس کی ایئر بس میں بیٹھ کر گھنٹے بھر میں پیرس پہنچ گیا۔

پچھلی رات کو مبارک حسین صاحب نے پایوں کی دعوت کی تھی۔ وہ بھی کئی سال سے لندن میں رہتے ہیں۔ دل چسپ آدمی ہیں اور خوب خاطر تواضع کرتے ہیں۔ پیرس روانگی سے پہلے دوپہر کو شبیر حسین صاحب اور ان کی بیگم ڈاکٹر ثمہ ناز حسین کے ہاں کھانا تھا۔ مزے دار کھانے کے علاوہ ۷۔۸ قسم کی آئس کریم خوب کھائی۔ پھر میں نے تو چائے بھی پی۔ شبیر حسین صاحب خوب چائے پیتے ہیں اور قدح بھر کر پیتے ہیں۔ چناں چہ میری ان کی خوب نبھی۔ حکیم صاحب تو چائے، پان، سگرٹ کسی کو ہاتھ نہیں لگاتے۔

۱۹

لندن بہت بڑا شہر ہے ساری دنیا میں مشہور ہے۔ کچھ عرصے پہلے تک یہ اُس سلطنت کا صدر مقام تھا جس میں سورج کبھی غروب نہ ہوتا تھا، لیکن میں ایک آزاد ملک کے شہری کی حیثیت سے ایک آزاد انسان کی حیثیت سے یہاں آیا تو میں سر اٹھا کر چلا، برابری سے بات کی۔ انگریزوں کی خوبیوں اور خامیوں کا آزاد ذہن سے جائزہ لیا۔ آزادی بھی کیسی نعمت ہے۔ غلامی قوموں کو کھا جاتی ہے۔ خدا کسی کو غلام نہ کرے۔ غلامی انسان کی روح کے لیے گھن ہے جو اندر ہی اندر ساری خوبیوں کو چاٹ ڈالتی ہے۔ ایک غریب، مگر آزاد ملک کا معمولی شہری بھی بڑے سے بڑے ملک اور بڑے سے بڑے آدمی کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر بات کر سکتا ہے۔ آزادی اس کی آنکھوں کی چمک بن کر اعتماد کی قوت میں ڈھل جاتی ہے۔

پیرس بھی بڑا شہر ہے۔ اپنا وطن سب سے پیارا ہے، لیکن پاکستان کے بعد میں فرانس کو ہی شاید دوسرا نمبر دوں اور میرے خیال میں میری طرح دنیا کے بہت سے لوگ ہوں گے جو اپنے وطن کے بعد فرانس کو ہی پسند کریں گے۔ فرانس میں سکون بھی بہت محسوس ہوا۔ بڑے شہروں کی بے تحاشا دھکا پیل، بھاگ دوڑ اور افراتفری وہاں نظر نہیں آتی۔ لوگوں کو بھی پُر سکون ہی پایا۔ اپنے آپ میں مگن دکھائی دیتے ہیں۔ ہر وقت ہوٹل بھرے رہتے ہیں۔ شراب بہت پیتے ہیں۔ چائے کا تو شاید پیرس کے لوگوں کو ذوق ہی نہیں ہے۔ بہت کم زور سی چائے ہوتی ہے اور وہ بھی مہنگی۔ کافی چائے سے سستی ہوتی ہے۔

ایک دن جناب آباد حسین (پیرس میں پاکستانی سفارت خانے میں منسٹر ہیں) کی طرف سے رات کے کھانے کی دعوت تھی۔ ڈاکٹر ایم اے قاضی (صدر پاکستان کے مشیر سائنس) بھی تھے۔ واپسی میں ایک فُٹ پاتھ پر لوگ جمع تھے۔ قریب پہنچے تو معلوم ہوا کہ کوئی گا رہا ہے، کوئی بجا رہا ہے، کوئی ناچ رہا ہے۔ بے فکرے نوجوان جمع ہیں اور گا بجا کر اپنی تھکن دُور کر رہے ہیں۔ فُٹ پاتھ پر جگہ نہیں رہی تو

آدھی سڑک بھی آدمیوں سے گھر گئی۔

ایک دن ٹیکسی پکڑ کر میں اکیلا ہی لُوور میوزیم دیکھنے پہنچ گیا۔ یوں تو سارا پیرس ہی عجائب گھر معلوم ہوتا ہے، لیکن لُوور کی کیا بات ہے۔ یہ کسی زمانے میں فرانس کے بادشاہوں کا محل تھا۔ موجودہ عمارت سولھویں صدی میں فرانسس اوّل نے بنوانی شروع کی تھی۔ اس میں اضافے لوئی چہاردہم اور نپولین نے کیے، تاہم اس کو عجائب گھر بنانے کا خیال اٹھارویں صدی میں پیدا ہوا۔ اب یہ دنیا کا سب سے بڑا عجائب گھر ہونے کا مُدعی ہے۔ اس کے چھے بڑے حصّے یا شعبے ہیں: (۱) مشرقی نوادِر (۲) مصری نوادِر (۳) یونانی و رومی نوادر (۴) مجسمے (۵) فن کے نادِر نمونے (۶) تصاویر۔

عمارت بہت بڑی ہے۔ میں نے داخل ہونے وقت بورڈ پڑھا تو معلوم ہوا کہ ٹکٹ سے داخلہ ہوتا ہے۔ میں اندر گیا۔ سب سے پہلے ہال میں چھپی ہوئی تصویریں اور کارڈ فروخت ہوتے ہیں۔ میں نے وہاں معلوم کرنا چاہا کہ داخلہ ٹکٹ کہاں ملے گا، مگر کچھ معلوم نہ ہوسکا۔ میں بھی فروخت ہونے والی تصویروں کو دیکھنے میں لگ گیا۔ خیال ہوا کہ دو ایک تصویریں تو خرید لی جائیں، مگر ایک تو قیمتیں ماشاء اللہ، پھر انتخاب آسان نہیں۔

لیونارڈو دا وِنچی

نظر ہر تصویر پر ٹھہر جاتی تھی، مگر دوسری تصویر پر پڑتی تو وہیں نگاہ جم جاتی۔

بہرحال یونہی کرتے کرتے ایک جائزہ لے لیا اور پھر اوپر کی منزل کی طرف قدم بڑھے۔ نہ ٹکٹ کی کھڑکی ملی نہ کسی نے ٹوکا کہ بغیر ٹکٹ کہاں جا رہے ہو۔ تصاویر (پینٹنگز) کا شعبہ ہی بہت بڑا تھا۔ اتنا بڑا کہ مسلسل ساڑھے تین گھنٹے تک رُکے بغیر چلتا رہا۔ کہیں کہیں ٹھٹکا ضرور۔ اچھا یہ "رفائیل" (RAPHAEL) کا شہ کار ہے۔ یہ "رُوبنز" (RUBENS) کے فن پارے ہیں۔ یہ "گویا" (GOYA) کی تصویریں ہیں۔

یہ کوئی تعجب کی بات نہیں ہے کہ لُوور میں سب سے زیادہ فن پارے فرانسیسی مصوروں کے ہیں۔ میں اگر ان ہزاروں تصویروں کو اس طرح دیکھتا جس طرح تصویروں کو دیکھنا چاہیے تو اس کے لیے ہفتوں بلکہ مہینوں درکار تھے، لہٰذا میں تو چلتا ہی رہا۔ دُم لینے کے لیے بھی نہیں بیٹھا۔ حال آنکہ کمروں کے درمیان میں کہیں کہیں بنچیں بھی ہوئی تھیں۔ ہاں چند منٹ رُکا تو لیونارڈو داونچی کی مشہورِ زمانہ تصویر "مونا لیزا"

مونا لیزا

کے سامنے۔ لیونارڈو اگرچہ اطالوی تھا، لیکن مونا لیزا کی اصل تصویر لُوور میوزیم پیرس میں ہے۔ اٹلی کے لوگ کہتے ہیں کہ لیونارڈو تو ہمارا تھا، لہٰذا مونا لیزا پر بھی ہمارا حق ہے۔ ایک بار مونا لیزا بھی چوری ہو چکی ہے۔ شاید اسی کے بعد سے لُوور والوں نے اس کو دیوار میں پیوست کر کے اس پر موٹا شیشہ چڑھا دیا ہے یا یوں کہیے کہ دیوار کے اندر الماری بنا دی ہے۔ اس پر بھی ان کو اطمینان نہیں ہوا تو انھوں نے وہاں پہرا چوکی بھی لگا دیا ہے۔ لہٰذا ایک سنتری وہاں ہر وقت کھڑا رہتا ہے۔ آرٹ کا یہ شہ کار جب چوری ہوا تو تمام دنیا کے اخبارات نے اس کی خبریں اس طرح شائع کی تھیں کہ جیسے دنیا کا کوئی بہت بڑا آدمی مر گیا یا کوئی بہت خطرناک حادثہ ہو گیا۔ تصویر تو مل گئی تھی، لیکن چور یا چوروں کا پتا آج تک نہیں چلا۔

مونا لیزا (یا "مونا لیسا") یہ اٹلی کی ایک خاتون کی تصویر ہے۔ اس کے چہرے پر ایک ہلکی سی، دبی دبی سی مسکراہٹ ہے۔ یہ مسکراہٹ یا تبسّم اتنا خفیف سا ہے کہ اگر اس کا مصوّر لیونارڈو اس پر چند برش اور چلاتا تو شاید یہ مسکراہٹ سرے سے ہی غائب ہو جاتی۔ یہ مسکراہٹ بھی ایک معمّا ہے۔ یہ عورت کس چیز پر کس بات پر مسکرا رہی ہے، کوئی نہیں سمجھ سکتا۔ اس تصویر میں مسکراہٹ کے علاوہ بھی بعض چیزیں غور کرنے کی ہیں۔ عورت کا جسم خاصا توانا ہے۔ وہ کوئی مٹی کا پتلا نہیں معلوم ہوتی بلکہ اصلی عورت دکھائی

دیتی ہے۔ لیونارڈو یہ جان دار تصویر اس لیے بنا سکا کہ وہ جانتا تھا کہ ہلکے بھاری رنگ کس طرح استعمال کیے جاتے ہیں اور روشن حصّے کو گہرائی میں کس طرح آمیز کیا جاتا ہے۔ ایک اور پہلو بھی اس تصویر کا توجہ طلب ہے اور وہ ہے اس کا پس منظر، جو ایک زمینی منظر (LANDSCAPE) ہے اور اس میں پہاڑ، ٹیلے اور چشمہ نظر آتا ہے، لیکن یہ چیزیں دُور ہونے کی وجہ سے جتنی مدھم دکھائی دینی چاہییں تھیں، مصوّر نے اس کا پورا خیال رکھا ہے اور لیونارڈو پہلا مصوّر تھا جس کو یہ مہارت حاصل تھی۔ دراصل لیونارڈو ایک جینئیس انسان تھا۔ وہ ایک آرٹسٹ ہی نہیں فنِ تعمیر کا ماہر، موسیقار، مجسمہ ساز، فلسفی، شاعر، ایتھیلیٹ، ریاضی داں، موجد اور علم الابدان کا ماہر بھی تھا اور آرٹ اس کی بہت سی دل چسپیوں اور مشغلوں میں سے ایک تھا۔ اسی لیے اس کی بنائی ہوئی تصویروں کی تعداد بہت کم ہے۔ آرٹ کے بعض ماہرین کی نظر میں لیونارڈو آج بھی دنیا کا بہترین آرٹسٹ (پینٹر) ہے۔ وہ ۱۴۵۲ء میں پیدا ہوا تھا اور ۱۵۱۹ء میں انتقال کر گیا۔ وہ بائیں سے دائیں نہیں لکھتا تھا جیسے انگریزی لکھی جاتی ہے بلکہ اردو کی طرح انگریزی کو بھی دائیں سے بائیں لکھتا تھا۔ اس کے وسیع علم کا اندازہ اس سے لگایا جا سکتا ہے کہ اس نے کوپرنیکس سے بھی پہلے یہ خیال ظاہر کیا تھا کہ سورج حرکت نہیں کرتا۔

تصویروں کے شعبے میں اتنا چل کر میں خاصا تھک گیا تھا، اس لیے نیچے آیا اور باہر نکل کر ایک ٹھنڈی بوتل پی۔ وہاں بھی ورانڈے کی سیڑھیوں پر ٹھیلوں میں بوتلیں لیے پھیری والے اسی طرح کھڑے رہتے ہیں جس طرح ہمارے ہاں سینماؤں وغیرہ کے باہر۔ اور جب لوگ اِدھر سے گزرتے ہیں تو لوور میوزیم میں بھی گاہک کو متوجہ کرنے کے لیے اسی قسم کی آوازیں نکالتے ہیں جس طرح ہمارے پاکستان میں۔

میں باہر نکلا تو ایک آدمی نے کہا، ٹھیرنا، ٹھیرنا، ہلنا نہیں، ذرا اسی طرح کھڑے ہو جاؤ۔ کیمرا دیکھ کر میں سمجھ گیا کہ یہ تصویر اُتارنا چاہتا ہے، لیکن میں تیار نہیں ہوا، اس لیے کہ مجھے "تجربہ کاروں" نے پہلے ہی آگاہ کر دیا تھا کہ یہ لوگ پیسے لے کر چلتے بنتے ہیں، تصویر نہیں دیتے۔ خیر میں تازہ دم ہو کر لوور میوزیم کے دوسرے حصّے دیکھنے کے لیے پھر واپس ہو گیا اور پھر خاصی دیر تک ان عجائب کو دیکھتا رہا اور ان لوگوں کی محنت اور سلیقے کی داد دیتا رہا۔

۲۰

لووْر میوزیم کے عجائب و نوادر دیکھ کر جب دوبارہ باہر نکلا تو چند آدمی پلاسٹک کے کبوتر بیچ رہے تھے۔ ان کی طرف متوجہ ہوا تو وہ اس طرح پیچھے پڑ گئے جس طرح پاکستان اور ہندستان کے خوانچے والے گاہک کو اپنی طرف کھینچتے ہیں۔ وہ کبوتر میں چابی بھر کر اُڑا اُڑا کر دکھا رہے تھے۔ ایک سے قیمت پوچھی تو تیس فرانک بتائی۔ میں نے انکار کر کے رُخ بدلا تو دوسرا آگے بڑھا۔ اس سے سودا ہو گیا اور میں نے بیس فرانک میں یہ مصنوعی کبوتر خرید لیا۔ ٹھنڈی بوتلیں بیچنے والوں میں لڑکیاں بھی تھیں، لیکن پہلوان قسم کی۔ وہ مردوں سے کچھ زیادہ تگڑی معلوم ہوتی تھیں۔ غرض وہاں سے واپسی کے لیے باہر نکلا۔ کاروں کے ہجوم میں پیدل چلتے وقت بڑی احتیاط سے قدم اُٹھانے پڑتے ہیں، ورنہ چُوکے اور مارے گئے۔

خراماں خراماں وسیع عمارت سے باہر نکلا۔ سڑک پار کی تو صاحب، پھر دریائے سین سامنے آ گیا۔ پُل آنے تک کنارے کنارے چلتا رہا۔ پھر پُل پار کر کے لوگوں کی چال ڈھال پر غور کرتا ہوا سین کے دوسرے کنارے پہنچ گیا۔ زیادہ بھیڑ نہیں تھی، بلکہ شہر کے اس حصّے میں کچھ ویرانی سی چھائی ہوئی تھی۔ اب

محرابِ فتح — پیرس

میں اندازے سے چل رہا تھا۔ مجھے اپنی منزل کی صحیح سمت نہیں معلوم تھی۔ مقصد بھی کچھ سیر گشت یا آوارہ گردی کرنا تھا۔ سین کے کنارے جو منڈیریں بنی ہوئی ہیں اُن میں ایک کٹاؤ آیا جہاں سے نیچے جانے کے لیے ایک اُتار (سلوپ) نظر آیا۔ بے اختیار میں اس طرف مڑ گیا، چند قدم آگے چل کر غور کیا کہ ایک کشتی (کروزر) کھڑی ہے۔ خیال ہوا کہ اس میں بیٹھ کر دریائے سین کی سیر کرنی چاہیے، لیکن اس کے پاس لوگ نظر نہ آئے۔ صرف ایک لڑکی واپس آتی دکھائی دی۔ اس سے پہلے کہ میں اس سے معلوم کرنے کی کوشش کروں خود وہ مجھ سے سوال کر بیٹھی کہ کیا اس کشتی میں سیر کی جاسکتی ہے۔ اندازہ ہوا کہ وہ بھی سیاح تھی۔

واپس اوپر آکر تھوڑا سا چلا تو کتابوں کی ایک دُکان نظر آئی۔ اس میں گھس گیا۔ کچھ انگریزی رسالوں کے علاوہ کتابیں زیادہ فرانسیسی میں تھیں۔ رفیق عزیز حکیم نعیم الدین زبیری کے لیے فونٹن پین خریدا۔ تحفے تحائف سفر کا ایک لازمی حصہ بن گئے ہیں۔ یاد آیا کہ جلد ہوٹل پہنچنا چاہیے۔ آج ڈاکٹر مظہر الحق صاحب کے ہاں دعوت ہے۔ وہ ہمیں لینے کے لیے خود آئیں گے۔ حکیم صاحب منتظر ہوں گے۔ ہوٹل ڈوکین پہنچا۔ حکیم صاحب نے فرمایا کہ ڈاکٹر مظہر الحق صاحب ہمیں لینے یونیسکو آئیں گے۔ اس لیے ہمیں وہاں چلنا ہے۔ جلدی جلدی نہا کر یونیسکو پہنچے۔ وہاں حکیم صاحب بھول بھلیوں میں سے ہوتے ہوئے ایک بڑے کمرے میں لے گئے۔ معلوم ہوا کہ یہ کمرا پاکستان کے لیے مخصوص ہے۔ وہاں ڈاکٹر ایم اے قاضی صاحب (صدرِ پاکستان کے مشیر سائنس) بھی موجود تھے۔ وہ حکیم صاحب کے دوست ہیں۔ وہاں بیٹھ کر تھوڑی دیر گپ شپ ہوئی۔ حکیم صاحب چاہتے ہیں کہ مسلم سائنس دانوں پر جامع کتابیں شائع کی جائیں۔ قاضی صاحب نے اس کی اہمیت سے اتفاق کیا۔ تھوڑی دیر میں ڈاکٹر مظہر الحق صاحب آگئے اور ہم ان کے ساتھ ان کے فلیٹ پر پہنچ گئے۔ گیارھویں منزل پر ان کا فلیٹ ہے۔ لفٹ سے اوپر پہنچے۔ ڈاکٹر صاحب عزیزی ڈاکٹر سہیل برکاتی کے استاد رہے ہیں، اور بہت مشفق و مہربان۔ سہیل میاں کو بھی پوچھتے رہے۔ کھانا ہوا۔ بڑا مزے دار کھانا تھا۔ ڈاکٹر صاحب کی بیگم بھی حال ہی میں پیرس پہنچی ہیں۔ وہ حج کو جانا چاہتی ہیں۔ ضابطے کی الجھن تھی۔ حکیم صاحب نے صحیح طریق کار بتایا۔ کھانے کے بعد ڈاکٹر صاحب ہمیں ہوٹل پہنچا گئے۔

ہوٹل میں حکیم صاحب سے تھوڑی دیر دوسرے دن کی یونیسکو کوریئر کی میٹنگ کے بارے میں بات چیت ہوتی رہی۔ میٹنگ میں شرکت کر کے اندازہ ہوا کہ چیف ایڈیٹر جناب ایڈورڈ گلیساں اور دوسرے

کارپرداز ہماری کارکردگی سے بہت مطمئن ہیں۔ اگرچہ حکیم صاحب کو گلیساں صاحب کا طریقِ کار زیادہ پسند نہیں آیا۔ تاہم حکیم صاحب نے طے کر لیا تھا کہ ہم "پیامی" کی اشاعت کے سلسلے میں مسائل و مشکلات کا ذکر نہیں کریں گے۔ ۲۶ زبانوں کے دوسرے ملکوں کے ایڈیٹر صاحبان بڑی تفصیل سے اپنے مسائل بیان کر رہے تھے۔ جب بھی گلیساں صاحب اظہارِ خیال کی دعوت دیتے حکیم صاحب رسالے کی ترقی و اشاعت کے سلسلے میں تو تجویزیں دیتے اور تدابیر بتاتے، لیکن خود اپنی کوئی مشکلات نہیں بتاتے۔ حال آنکہ پیامی کے سلسلے میں مشکلات تو پیش آتی رہتی ہیں اور فروری ۱۹۷۷ء سے یونیسکو کوریئر کے اردو ایڈیشن پیامی کی اشاعت پر بڑی محنت ہو رہی ہے۔ سب سے بڑا مسئلہ تو پاکستان کے دانشوروں کی دل چسپی میں کمی ہے۔ اتنا مفید اور اہم رسالہ حکیم صاحب نے اردو میں اسی لیے شروع کیا تھا کہ اس سے اردو کی خدمت ہو گی اور پاکستان کے پڑھے لکھے لوگوں کو دنیا کو درپیش مسائل کے بارے میں معلومات ہوں گی اور ان کی آنکھیں کھلیں گی۔ بہرحال ہم نے پاکستان کے بارے میں اچھا تاثر چھوڑنے کی کوشش کی۔

ایک دن میں پیرس کا مشہور اور تاریخی گرجا" نوتر دام دیکھنے پہنچ گیا۔ ٹیکسی پکڑی تو اس نے

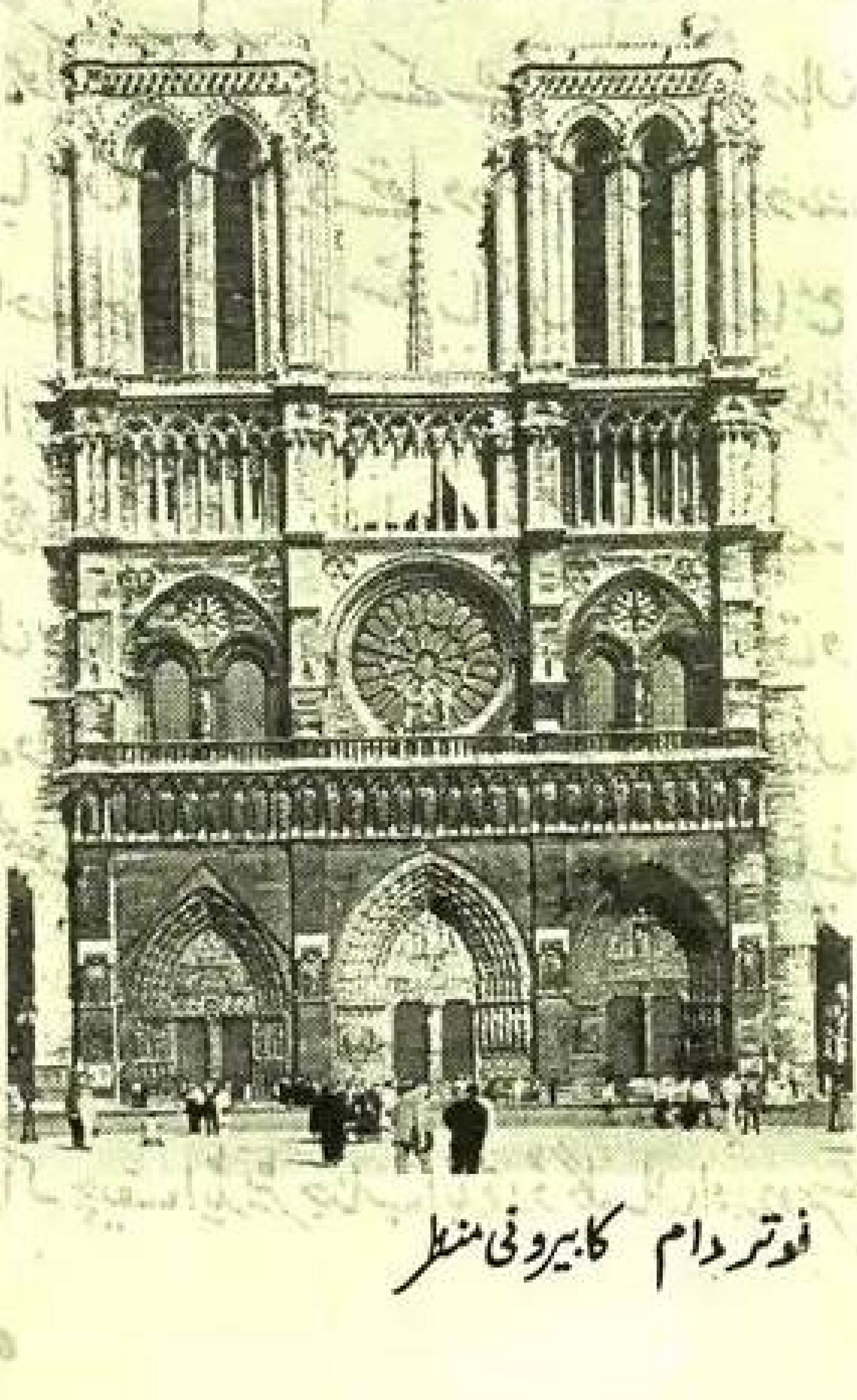

نوتر دام کا بیرونی منظر

نپولین کا مقبرہ — بیرونی منظر

خاص گرجا کے سامنے اُتار دیا۔ وہاں بعض ٹیکسیوں میں لکھا ہوتا ہے کہ سگرٹ پینا منع ہے۔ بلکہ سگرٹ کی تصویر بھی لگی ہوتی ہے اور اس پر کانٹا بنا ہوتا ہے۔ اس ٹیکسی والے نے مجھ سے زبانی بھی کہا کہ ٹیکسی میں سگرٹ نہ پینا۔ کتنا صحت بخش مشورہ تھا۔

نوتر دام میں داخل ہوا۔ کیا خوب صورت عمارت ہے۔ اس گرجا گھر (وہ اس کو کتھیڈرل نوتردام کہتے ہیں) کی تعمیر کا آغاز ۱۱۶۳ء میں ہوا۔ اس کو بعض لوگ تاریخِ فرانس کا گرجا بھی کہتے ہیں۔ اس عمارت کی شان اور سجاوٹ دیکھنے سے تعلق رکھتی ہے۔ بہت بلند عمارت ہے۔ اس کی دیوار یں خوب صورت مجسموں اور نادر تصویروں سے سجی ہوئی ہیں۔ کھڑکیوں کو طرح طرح کے رنگوں سے روشن کر رکھا ہے۔ اس میں کئی تاریخی موقعوں پر جشن بھی منائے جا چکے ہیں۔ نپولین کی تخت نشینی بھی اسی گرجا گھر میں انجام پائی تھی۔ ہمارے ہاں نوترے دیم کا نام ناول "نوتر دام کا کُبڑا" (دی ہنچ بیک اوف نوتر دام) کی وجہ سے زیادہ عام ہوا ہے جو وکٹر ہیوگو کا لکھا ہے، پھر جب اسی نام سے ایک فلم بنی تو یہ گرجا اور بھی مشہور ہوا۔ کیمرا میرے ہاتھ میں تھا۔ میں نے گرجا کے ایک اندرونی کمرے میں جا کر ایک تصویر کھینچی، جس میں ایک خاتون بھی آگئیں، پھر انھی خاتون کو کیمرا پکڑا کر اُن سے درخواست کی کہ وہ اس کی شیشوں کی الماری کے پس منظر میں میری بھی ایک تصویر اُتار دیں، جس کو انھوں نے خوش دلی سے قبول کر لیا۔

نوتر دام سے نکلا تو سین کے کنارے کنارے بہت سے کیبن نظر آئے، جن میں پرانی کتابیں، رسالے اور تصویریں فروخت ہوتی ہیں۔ یہ چیزیں دُکان دار یا ان کے ایجنٹ مختلف شہروں سے لا کر یہاں بیچتے ہیں۔

نپولین کا مقبرہ بھی دیکھنے کی چیز ہے۔ نپولین بونا پارٹ بڑا اہم آدمی تھا۔ اس نے بڑی ترقی کی۔ اس کو فرانس سے بہت محبّت تھی۔ یہ عمارت اِن وے لڈس (INVALIDES) فرانس کے ایک بادشاہ نے بنائی تھی اور گرجا کے لیے بنائی تھی۔ یہ عمارت بھی نہایت نفیس ہے۔ نپولین کو ۱۸۱۴ء میں تخت سے دستبردار ہونا پڑا اور ۱۸۱۵ء میں واٹر لُو کے میدان میں آخری شکست ہوئی اور سینٹ ہیلینا میں جلا وطن کر دیا گیا، جہاں ۱۸۲۱ء میں اس کا انتقال ہو گیا۔ ۱۸۴۰ء میں سینٹ ہیلینا سے اس کی لاش لا کر اس شان دار مقبرے میں دفن کی گئی۔ یہ فرانسیسیوں کی نپولین سے محبّت کا ایک ثبوت ہے۔ اس عمارت کو دیکھ کر تاج محل یاد آتا ہے۔ اگرچہ تاج محل کی برابری نہیں کر سکتی۔ ہیں دونوں

مصنف — نوتر دام میں

مقبرے ہی۔ تاج محل شاہ جہاں نے اپنی چہیتی بیوی کی یاد کو زندہ و پائندہ رکھنے کے لیے بنایا تھا، مگر "اِن وے لِڈس" ایک عبادت گاہ کے لیے بنائی گئی تھی، لیکن اب وہ نپولین کے مقبرے کی وجہ سے مشہور ہے۔ نپولین اتنا بڑا اور بہادر آدمی تھا، لیکن کہتے ہیں کہ وہ بلّی سے ڈر جایا کرتا تھا۔ اس کا قد ٹھنگنا تھا، لیکن تاریخ میں اس کا نام بڑا ہے۔ اس نے وقت کی قدر کرکے اتنا اونچا مقام حاصل کیا۔ اس نے کہا تھا کہ میں اپنے حریفوں پر اس لیے غالب آجاتا ہوں کہ وہ چند لمحوں کو عموماً کچھ نہیں سمجھتے، لیکن میں ان لمحوں کی قدر و قیمت خوب سمجھتا ہوں۔

عمارت کے اندر داخل ہوتے ہی کچھ مشینیں نظر آتی ہیں۔ یہ مشینیں ایک طرح کا گراموفون ہیں۔ ان میں سے کسی مشین میں دو فرانک کے سکّے ڈالیے اور فون کا ساریسوَر اُٹھا کر کان سے لگا لیجیے اور عمارت کی تاریخ سُن لیجیے۔ یہ دیکھ کر مجھے علامہ اقبال کا ایک قول یاد آیا۔ انھوں نے کیسی عجیب و غریب اور مزے دار بات کہی تھی:

"تاریخ ایک طرح کا ضخیم گراموفون ہے، جس میں قوموں کی صدائیں محفوظ ہیں۔"

ہوٹل ڈوکین سے نپولین کا مقبرہ زیادہ دُور نہیں ہے۔ میں جب اس کے قریب پہنچ گیا اور

سڑک پار کرنا چاہتا تھا کہ ایک آواز آئی جیسے کوئی مجھے پکار رہا ہے۔ میں نے آواز کی طرف نظر اٹھائی تو ایک صاحب عمدہ سی کار میں بیٹھے ہیں۔ انھوں نے مجھے ہاتھ کا اشارہ کر کے قریب بلایا۔ میں سمجھا کہ شاید ان کو کہیں کا پتا پوچھنا ہوگا۔ کار کے پاس پہنچا تو ان صاحب نے کہا کہ میں اٹلی سے یہاں ایک نمائش میں آیا تھا۔ کار کی گیس ختم ہو گئی ہے۔ (یورپ والے کار کے پٹرول کے بجائے گیس کا لفظ ہی استعمال کرتے ہیں)۔ میرے پاس یہ دو زنانے کوٹ بچ گئے ہیں۔ میں آپ کو بیچ نہیں رہا ہوں بلکہ تحفے کے طور پر دے رہا ہوں، مگر مجھے گیس کے لیے پیسے چاہییں۔ یہ کہہ کر اُس نے دو بہت عمدہ زنانہ کوٹ دکھائے۔ کوٹ واقعی بہت نفیس تھے۔ میں نے کہا کہ بھائی، میں تو خود مسافر ہوں، میرے پاس پیسے کہاں ہیں۔ ویسے آپ کو کتنے فرانک کی ضرورت ہے؟ اس نے کہا کہ ایک ہزار۔ میں نے کہا کہ مجھے بہت افسوس ہے کہ میں آپ کی مدد نہیں کر سکتا۔ اس نے کہا کہ اچھا پانچ سو فرانک دے سکتے ہو؟ میں نے معذرت کی اور کہا کہ میرے پاس سو دو سو فرانک سے زیادہ نہیں ہیں۔ اس نے فوراً اپنی کار اسٹارٹ کی اور یہ جا وہ جا۔ اس نے یہ بھی کہا تھا کہ میں صحافی ہوں۔ میں نے اس سے وزیٹنگ کارڈ مانگا، لیکن اس کے پاس ہوتا تو وہ بناتا۔ کوئی اُچکا تھا۔ میں چوراہا پار کر کے نپولین کے مقبرے میں پہنچ گیا۔

پیرس میں شاید ٹریفک کے اصول کچھ مختلف ہیں۔ وہاں چوراہوں پر کچھ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ بجائے چار طرف کے آٹھ طرف سے کاریں آتی جاتی ہیں۔

نپولین کے مقبرے میں داخل ہوتے کا ٹکٹ ہے۔ دس فرانک کا ٹکٹ مہنگا معلوم ہوا۔ عمارت کے ایک وسیع کمرے میں ایک خاصا کشادہ سا کنواں ہے۔ اس کے اندر نپولین کی قبر ہے۔ اگر عمارت کی خوبیاں بیان کرنا چاہوں تو اس کے لیے اتنی فنی اصطلاحات استعمال کرنی پڑیں گی کہ عبارت بوجھل ہو جائے گی۔ بہرحال مقبرہ دیکھ کر باہر آیا تو احاطے کے اندر ہی کشادہ لان ہے جس میں رنگا رنگ پھول عجب بہار دے رہے تھے۔ میں تھوڑی دیر سستانے کو ایک بنچ پر بیٹھ گیا۔ وہاں ہالینڈ سے آیا ہوا ایک جوڑا بھی بیٹھا تھا۔ تھوڑی دیر بیٹھ کر میں باہر آیا اور ایک ٹھیلے والے سے پیرس کا پنوراما ۱۵ فرانک میں خریدا، جس میں آنکھ لگا کر بٹن دباتے جائیے اور پیرس کے تمام تاریخی اور قابلِ دید مقامات دیکھتے جائیے۔

ایک دن شانزالیزے بازار گیا۔ اس کو فرانس کا ہی نہیں بلکہ ساری دنیا کا حسین ترین بازار کہا

جاتا ہے۔ کشادہ سڑک کے دونوں طرف شاہ بلوط کے شاداب درخت لگے ہیں۔ بہت لمبی سڑک ہے جو محراب فتح پر جاکر ختم ہوتی ہے۔ اس بارونق سڑک پر دُکانوں کے علاوہ متعدد سینما گھر بھی ہیں۔ سوچا کہ دیکھنا چاہیے یہاں کیسی فلمیں چلتی ہیں اور جو سینما گھر سب سے پہلے سامنے آیا اس میں گھس گیا۔ کھڑکی پر پہنچا تو ٹکٹ فروش خاتون نے پوچھا "کون سی فلم کا ٹکٹ؟" "اچھا، یہاں تین فلمیں بیک وقت چل رہی ہیں!" سامنے ایک تصویر لگی ہوئی تھی اُس کی طرف اشارہ کر کے کہہ دیا کہ اس کا ۲۸ فرانک یعنی کوئی پچاس رُپے کا ٹکٹ تھا خرید لیا اور ہال میں داخل ہو گیا۔ اندھیرے گھُپ میں ٹٹول ٹٹول کر آگے بڑھا اور جو پہلی کُرسی ملی اُس پر اپنے کو دھنسا دیا۔ مشکل سے ایک گھنٹہ بیٹھا اور فلم ادھوری چھوڑ کر چلا آیا۔ یہ ایک امریکی فلم تھی۔ مقصد یہ تھا کہ دیکھوں یہاں فلموں کا انداز کیا ہے۔ وہی مار دھاڑ، عریانی اور جاسوسی کا مرکب تھی۔ بس اندازہ ہو گیا۔ اب وقت خراب کرنے سے کیا فائدہ تھا۔ باہر نکل کر ایک دُکان میں داخل ہوا۔ ریشمی کپڑے، ملائم، خوب صورت ڈیزائن اور لمبے عرض کے کپڑے۔ کیا کہنے۔ اصلی ریشم کا کپڑا اب کہاں دیکھنے میں آتا ہے۔ مصنوعی ریشے نے اصلی ریشے کی جگہ لے لی ہے۔ نائلون، ٹیرون اور پولیسٹر کی حکومت ہے۔ مگر اصلی ریشمی

نوتر دام کا ایک حصّہ

کپڑے کے دام؟ بس یوں سمجھیے کہ پاکستانی رُپے کے لحاظ سے کوئی کپڑا بارہ تیرہ سو رُپے میٹر سے کم نہ تھا۔ سفر میں اتنے پیسے خرچ کرنے کی سکت کہاں ہوتی ہے۔

شانزالیزے اور پیرس کے دوسرے بازار، گلی کوچے، مکانات اور دفتر دیکھ کر خیال ہوتا ہے کہ صفائی ستھرائی کا اتنا خیال کیوں رکھتے ہیں کہ دھول مٹی کا نام و نشان تک مٹا دیا ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یہاں کی ساری دھول پاکستان برآمد کر دی گئی ہے اور یہاں پھول ہی پھول رہ گئے ہیں۔ پیرس میں پیدل بھی خوب گھوما پھرا، لیکن ایک دن بھی جوتے پر پالش کی ضرورت نہیں پڑی۔ اتنی صاف شفاف سڑکوں اور گلیوں میں جوتے کا پالش کیوں خراب ہوتا۔

وقت کم تھا، بہت کم، پیرس بہت بڑا شہر ہے اور یہاں بے شمار چیزیں دیکھنے کے قابل ہیں۔ تھوڑے سے دِنوں میں جتنا دیکھ سکتا تھا دیکھا۔ فرانس کے لوگ بہت زندہ دل اور شگفتہ مزاج ہوتے ہیں۔ زندگی کو پوری دِل چسپی کے ساتھ برتتے ہیں۔ ان کو اپنی تہذیب جان سے زیادہ عزیز ہے۔ وہ بڑے شوقین لوگ ہیں۔ ہر شوق کو وہ انتہا تک پہنچا دیتے ہیں۔ وہ جو چیز بھی بناتے ہیں بڑی محنت اور محبت سے بناتے ہیں اور اس میں کسی خامی کا امکان نہیں چھوڑتے۔ ان کا دعوا یہ ہے کہ یورپ کی موجودہ قوموں میں ان کی قوم سب سے قدیم ہے۔

سفر کے دوران غور کرتا رہا کہ یہ لوگ ویسے تو اتنے مہذّب، معتدل اور شائستہ ہیں، ذاتی طور پر نہایت منکسر المزاج اور پُرامن، لیکن اس کے باوجود اپنے دفاع کے نام پر ایک سے ایک مہلک ہتھیار بنانے میں اپنی ساری سائنس صَرف کر ڈالتے ہیں۔ ہر ترقی یافتہ اور امیر ملک اربوں ڈالر فوج اور فوجی ساز و سامان پر خرچ کرتا ہے۔ کہتا یہ ہے کہ دوسری طاقتوں کی جارحیت اور خباثت کا مقابلہ کرنے کے لیے یہ ضروری ہے۔ ایک ایٹمی تجربے پر جتنی دولت خرچ کی جاتی ہے اس سے نہ معلوم کتنے تعلیمی ادارے اور کتنے ہسپتال کھولے جا سکتے ہیں۔ معلوم نہیں انسان کو کب انسان کی قدر آئے گی۔

۱۱۔ ستمبر ۸۲ء کو صبح ۹ بجے سوئس ایر کے ہوائی جہاز میں چارلس ڈیگال ایر پورٹ سے روانہ ہوا۔ راستے میں زیورخ پر ہوائی جہاز بدلا۔ دو گھنٹے رُک کر فرانس کے وقت کے مطابق ۹ بجے اور پاکستان کے وقت کے مطابق رات ۱۲ بجے کراچی اُترا۔ پاکستان آ گیا۔ اپنا وطن پیارا پاکستان۔

(ختم شد)

وہ کون تھا؟

- وہ پونے دو سال کا تھا کہ یتیم ہو گیا۔
- اس نے غربت اور مفلسی کی گود میں آنکھ کھولی مگر اعلا تعلیم حاصل کی اور ملک کا سب سے بڑا لیڈر بنا۔
- وہ سارا سال کھیل کود میں گزارتا مگر امتحان میں اچھے نمبروں سے پاس ہوتا۔
- تعلیم کے بعد وہ پرنسپل بنا، محکمۂ افیون کا افسر بنا، کمشنر بنا، اس کو وزارت پیش کی گئی، چیف سکریٹری بنانا چاہا، مگر اس نے غلامی پسند نہ کی اور آزادی کے لیے اپنی زندگی وقف کر دی۔
- اُس نے انگریزی میں اخبار نکالا اور انگریز حاکموں سے اپنی انگریزی کا لوہا منوا لیا۔
- اس نے اُردو اخبار نکالا اور عوام کو جگا دیا۔
- وہ مسلمانوں کی سب سے بڑی جماعت مسلم لیگ کے بانیوں میں سے تھا، وہ جیل میں تھا مگر مُسلم لیگ کا صدر چُنا گیا اور اس لیے اس کی تصویر صدارت کی کرسی پر رکھی گئی۔
- وہ سچائی اور آزادی کے جرم میں بار بار قید کیا گیا مگر اس کا جذبہ بڑھتا ہی گیا۔
- وہ بیمار تھا، لیکن اس نے اخبارات نکالے، تقریریں کیں، دورے کیے، جلوس نکالے اور یورپ کے سات سفر کیے۔
- اُس نے بہت کم عمر پائی، کُل ۵۱ سال۔ آدھی عمر تعلیم حاصل کرنے میں صرف ہو گئی۔ آدھی عمر بیماری، قید اور سفر میں کٹی مگر وہ دُھن کا پکا اور بات کا سچا تھا۔ آزادی حاصل کرنے کی کوشش سے باز نہ آیا۔ یہاں تک کہ وطن کے لیے لڑتے جھگڑتے وطن سے دُور جان دے دی۔
- وہ کون تھا؟ وہ محمد علی جوہر تھا۔
- **محمد علی جوہر** کی مزے دار سبق آموز کہانی **جوہر قابل** میں پڑھو جو مسعود احمد برکاتی نے لکھی ہے۔

دوسرا ایڈیشن   قیمت: سات رُپے

ہمدرد فاؤنڈیشن پریس، ناظم آباد، کراچی

5371
HEDAR COLLECTION
12.6.96

ہمدرد فاؤنڈیشن پریس، کراچی

RekhtaDownload.com